مرزا عبدالقادر بیدل
شخصیت اور شاعری
ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

میرزا عبدالقادر بیدل

شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
ممتاز پروفیسر
(Distinguished Professor)
جی سی یونی ورسٹی لاہور

335-K2 Wapda Town, Lahore.
www.alwaqarpublications.com

ناشر : سید وقار معین

0300-8408750

0321-8408750

042-35224607

سال اشاعت : 2014ء

طابع : گنج شکر پریس، لاہور

قیمت : -/395 روپے

فہرست مضامین

پیش لفظ

میرزا عبدالقادر بیدل فارسی شاعری میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں، اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ فن شاعری اور معانی و مطالب کے لحاظ سے تمام فارسی شعرا میں ان کی حیثیت منفرد ہے ___ میرزا بیدل کے کلام میں فن شاعری کے کمال کے ساتھ زندگی کے حقایق اور عوامی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے، ان کا کلام عظمت انسانی اور خودشناسی کے مضامین سے پُر ہے، وہ کاہلی، بیکاری، تقلید اور روایت پرستی کی شدید مذمت اور تحقیق، حصول آگہی اور سعی و کوشش کی تلقین نہایت شدومد سے کرتے ہیں، یوں میرزا عبدالقادر بیدل فارسی شعرا میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔

یہ کتاب ''میرزا عبدالقادر بیدل ___ شخصیت اور شاعری'' جو موضوع سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، امید ہے اہل ذوق اور اہل دل حضرات کی نظر میں پسندیدہ قرار پائے گی۔

ظہیر احمد صدیقی

میرزا عبدالقادر بیدل
شخصیت اور شاعری

میرزا عبدالقادر بیدل فارسی شاعری کے بلند پایہ اور مسلم الثبوت استاد تھے۔تمام تذکرہ نگاروں اور نقادانِ سخن نے ان کے فن اوران کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔رضا قلی ہدایت نے ریاض العارفین میں ''مرجع اہل کمال وملجای ارباب حال'' بندرابن داس خوشگو نے سفینہ خوشگو میں ''قبلۂ لفظ و کعبۂ معانی' کد خدای سخن و خداوند سخندانی'' محمد افضل سرخوش نے کلمات الشعراء میں ''استادفن'' آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں ''پیر میکدۂ سخندانی و افلاطونِ خم نشینِ یونانِ معانی'' اور میرزا غالب نے ''بحر بیکران اور محیط بے ساحل'' کے الفاظ سے میرزا بیدل کی شخصیت اوران کے فکروفن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔میرزا غالب نے شاعری میں میرزا بیدل کو اپنا استاد معنوی مانا ہے اور ریختہ میں یعنی اردو شعر گوئی میں طرز بیدل کی پیروی بھی کی ہے۔(۱) اگر چہ طرز بیدل کی پیروی کے سلسلہ میں خود میرزا بیدل کا دعویٰ تو یہ ہے کہ طرز بیدل کی پیروی نہیں کی جاسکتی' بھلا جادو بھی معجزے کی برابری کرسکتا ہے:

مدعی در گذر از دعوی طرز بیدل
سحر مشکل کہ بہ کیفیتِ اعجاز رسد

علامہ اقبالؒ میرزا بیدلؒ کے فکروفن کی عظمت کے معترف تھے' مجنون گورکھپوری' (۲) عابد علی عابدؔ' (۳) عباداللہ اخترؔ' (۴) ڈاکٹر عبدالغنیؔ' (۵) اور خواجہ عبدالرشید نے اپنی نگارشات میں میرزا بیدل کو ایک عظیم شاعر اور مفکر مانا ہے۔مؤخرالذکر نے تو میرزا بیدل کو

مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کا ہم پلّہ قرار دیا ہے۔ افغانستان اور وسط ایشیا میں میرزا بیدل کا کلام عوام و خاص میں بے حد مقبول ہے، وہاں کے اہلِ علم اور صاحبانِ نقد و نظر انہیں ''خدائے سخن'' کا مقام دیتے ہیں۔

بیدل کا نام میرزا عبدالقادر، والد کا نام میرزا عبدالخالق اور کنیت ابوالمعانی تھی۔ سال ولادت ۱۰۵۴ھ ہے۔ ایک بزرگ ابوالقاسم ترمذی نے ''فیض قدس'' اور ''انتخاب'' سے سال ولادت نکالا تھا۔ میرزا عبدالقادر کو کچھ تذکرہ نگار عظیم آبادی، کچھ اکبر آبادی، کچھ لاہوری اور کچھ شاہجہان آبادی لکھتے ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی جائے ولادت پٹنہ عظیم آباد بتائی ہے، حقیقت میں وہ اکبر نگر عرف راج محل بنگال میں پیدا ہوئے تھے۔ میرزا کو کچھ تذکرہ نگار مغلوں کے قبیلہ برلاس اور کچھ ارلات اور کچھ ارلاس سے نسبت دیتے ہیں لیکن محمد شفیع وارد کے بیان کے مطابق بیدل نے انہیں بتایا تھا کہ وہ شاہ منصور بن مظفر بادشاہ فارس ممدوح خواجہ حافظ کی اولاد میں سے ہیں۔ ہوسکتا ہے شاہ منصور ارلاس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ میرزا عبدالقادر بیدل پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ ان کے چچا مرزا قلندر نے ان کی پرورش اور تربیت کی تھی، انہی کی زیرِ نگرانی کافیہ اور شرح ملاّ تک عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف بزرگوں سے عقیدت رہی۔ شروع میں رمزی تخلص کرتے تھے۔ ایک روز دیباچہ گلستان میں یہ مصرع نظر آیا ۔

بیدل از بے نشان چہ گوید باز

اس مصرع سے ایسے متاثر ہوئے کہ اپنا تخلص بیدل رکھ لیا۔ بیدل کے معنی عاشق کے بھی ہیں اور بیدل کا مفہوم تصوف میں یہ بھی ہے کہ قلب سالک خواطر و خطرات سے پاک ہو۔ بقول مصنف سفینۂ خوشگو میرزا بڑے وجیہہ و شکیل تھے اور ایسے زورمند کہ بڑے بڑے پہلوان بھی ان سے پنجہ آزمائی کرنے سے کتراتے تھے۔ میرزا ایک منٹ میں انہیں چت کر دیتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا بیدل نے پنجہ آزمائی اور زور آزمائی کے لئے ایک گھوڑا پالا ہوا تھا۔ ایک دفعہ پاؤں پھسلا تو دیوار کا سہارا لینا چاہا' دیوار ان کے زور کو برداشت نہ کر سکی اور گر گئی۔ ایک دفعہ ایک گھوڑے کے تاجر سے میرزا نے شرط باندھی کہ اگر اس کا عراقی نژاد گھوڑا' جس کی قیمت وہ ایک ہزار روپیہ مانگتا تھا' دوڑ میں ان کے ساتھ برابری کرے گا تو دو ہزار میں خرید لیں گے۔ اگر وہ دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا تو گھوڑا مفت میں دینا ہوگا۔ دوڑ ہوئی اور گھوڑا پیچھے رہ گیا۔ شرط جیتنے کے باوجود میرزا نے گھوڑا اسے ہی واپس کر دیا۔ میرزا ہاتھ میں لوہے کا عصا رکھتے تھے' جس کا وزن ۳۶ سیر شاہجہانی تھا اور اس کا نام بولاس یا نولاسی تھا جس کے معنی ہیں شاخ نازک کے۔ یہ عصا مصنف سفینہ خوشگو کے زمانے میں عرس کے موقع پر قبر کے پہلو میں رکھا جاتا تھا اور اس عصا کو بڑا طاقتور آدمی بھی بمشکل اٹھا سکتا تھا۔ مصنفِ سفینۂ خوشگو کا کہنا ہے کہ اگر کوئی یقین نہ کرے تو آئے' خود کو آزمائے اور ''ملاحظۂ قدرت قوی نماید''۔ ایک دفعہ کسی نے ظریفانہ انداز میں اس شاخِ نازک کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرزا نے بھی از راہ تفنن فرمایا کہ عصا سنت انبیا' زینتِ صلحا' مونس اعمیٰ' ممد ضعفا اور دافع اعدا ہے۔ یعنی عصا انبیا کی سنت ہے' نیک لوگوں کی زینت ہے' نابیناؤں کا غم خوار ہے' کمزوروں کا مددگار ہے' دشمنوں سے بچانے والا ہے۔

بیدل نہایت خوش خلق اور متواضع شخصیت کے مالک تھے لیکن بڑے خوددار اور حساس بھی تھے۔ جب شاہزادہ اعظم کے ایک درباری ایزد بخش سے ان کی ملاقات ہوئی تو ایزد بخش رسا نے مرزا کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات اس پر معنی فقرے میں قلم بند کیے:

بیدلِ ہمہ دل را دیدم (۶)

یعنی بیدل جو تمام تر دل ہیں (اہل دل ہیں) ان سے ملاقات ہوئی۔

ایک روز نظام الملک آصف جاہ کے گھر پر محمد امین خان سے جو بڑے سنگدل اور تاریخ میں امیر الامراء حسین علی خان کے قاتل کی حیثیت سے مشہور ہیں ملاقات ہوئی، انہوں نے میرزا کے داڑھی منڈوانے پر اعتراض کیا تو میرزا نے برجستہ جواب دیا:

''ریش خود می تراشم دل کسی نمی خراشم''، یعنی میں ریش تراشی کرتا ہوں کسی کی دل خراشی نہیں کرتا' اس جملہ سے میرزا محمد امین برافروختہ ہو گئے۔ میرزا بیدل بھی ان کے سامنے تن گئے۔ بمشکل نظام الملک نے بیچ بچاؤ کرایا۔ بیدل کا یہ شعر ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے:

با کمال سر کشی بیدل تواضع طینتم
ہمچو زلف یار می نازد بما افتادگی

یعنی انتہائی سرکشی کے باوجود اے بیدل میں بہت منکسر المزاج ہوں' زلف یار کی طرح جھکنا ہمارے لیے باعث فخر و ناز ہے۔

میرزا بیدل شہزادہ محمد اعظم شاہ کی ملازمت میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ایک روز شہزادے نے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے شہزادے کی خدمت میں قصیدہ پیش کرنے کے بجائے ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ ایک بار امیر الامراء حسین علی خان نے کئی لاکھ روپے بڑے نیاز مندانہ طور پر پیش کیے۔ میرزا نے یہ کہہ کر لوٹا دیئے کہ آپ کے پاس محفوظ رہیں گے۔ میرے پاس تو رکھنے کی کوئی جگہ نہیں ___ یہ تمام حقائق میرزا کی عظیم شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

میرزا بیدل حکمت و فلسفہ سے بخوبی آشنا تھے' وہ صوفی صاف دل اور عالم باعمل تھے اور نشیب و فرازِ زمانہ سے آگاہ بھی۔ میرزا بیدل نے یتیمی کا درد بھی سہا تھا' غربت و افلاس کی سختیاں بھی جھیلی تھیں، اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی رہے تھے' عوام و خواص میں اپنی

مقبولیت کا دور بھی دیکھا تھا' شاہجہان و عالمگیر کا مستحکم و خوشحال عہد بھی ان کی نظر میں تھا اور عہد جانشینان عالمگیر کی طوائف الملو کی اور بدحالی بھی ان کے سامنے تھی ___ میرزا بیدل نے اپنے تمام تاثرات اور افکار کو اپنے خاص اسلوب کے ساتھ نظم و نثر میں پیش کیا ہے۔ مابعدالطبیعیاتی مسائل یا زندگی کے بنیادی حقائق کے علاوہ میرزا بیدل نے زندگی کے عام مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور انہیں اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔

عام طور پر میرزا بیدل کو شاعرِ تصوف سمجھا جاتا ہے' اگرچہ وہ خود صوفی صاف دل بھی تھے' تصوف کے مسائل کو انہوں نے اپنے شعروں میں پیش بھی کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیدل شاعرِ حیات ہیں۔ اپنی شاعری میں انہوں نے حقائقِ حیات کی ترجمانی بڑے منفرد اور فنکارانہ انداز میں کی ہے اور تصوف بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے سو اس کا بیان بھی ان کے کلام میں ہے۔ گویا ان کی نظر میں تصوف کل نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کا جزو ہے۔ خدا' انسان اور کائنات ان کے فکر و فن کے بنیادی موضوعات ہیں۔ عشقِ الٰہی کا جذبہ ان کے بیشتر کلام میں رچا بسا ہوا ہے لیکن یہ جذبہ بہت ہی وسیع' عمیق اور ہمہ گیر ہے جو شعور و آگہی کا سرچشمہ ہے اور عظمتِ انسانی و محبتِ عالمگیر کی بنیاد بھی۔ عشقِ خدائے وحدہ لاشریک لہ نے ان کے افکار کو نہ صرف عظمت و رفعت بلکہ وحدت و جامعیت اور توازن و اعتدال بھی بخشا ہے۔ دنیاداری ہو کہ ترک دنیا' غنا ہو یا فقر' عجز ہو یا غرور' عقل ہو یا عشق' توکل ہو یا کار و کوشش' غرض ہر مسئلۂ حیات پر ان کا نظریہ جامع اور متوازن ہے۔ عقل و عشق یا جنون و خرد کے تصورات کو عام طور پر شعرا نے بڑے ہی انتہا پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے لیکن اس تصور کے بارے میں میرزا بیدل کا نظریہ بڑا ہی جامع اور متوازن ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں عقل و جنون کے دائرۂ کار کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ دونوں کی اہمیت واضح ہوگئی ہے:

باہر کمال اندکی آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ ای بی جنون مباش

یعنی ہر کمال کے ساتھ تھوڑی سی دیوانگی یا جنونی کیفیت اچھی لگتی ہے، تم اگرچہ عقلِ کُل بن گئے ہو پھر بھی جنون کے بغیر نہ رہئے۔

میرزا بیدل کا کلام حقائق و معارف سے پُر ہے۔ ان کے کلام میں خدا شناسی کے مضامین بھی ہیں اور خود شناسی اور عالم شناسی کے بھی۔ اگرچہ کائنات میں ہر شے ذات و صفاتِ حق سے ظہور پذیر ہوئی ہے جسے وہ اپنے رنگ میں یوں فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو کتاب اللہ کی روشنائی ہے اور جو کچھ تم بولتے ہو وہ اس کا صریر خامہ ہے:

آنچہ بینی سواد نامۂ او است
ہر چہ گویی صریر خامۂ او است

اس حقیقت کے باوجود کہ کائنات میں ہر شے کا ظہور خدا کی ذات وصفات سے ہے لیکن اس کائنات، انسان اور خدا کی مثلث میں فلسفہ بیدل کے مطابق بنیادی حیثیت انسان ہی کو حاصل ہے۔ بقول میرزا بیدل دنیا ہو یا آخرت اس خانۂ گمان کا معمار تو آدمی ہے:

چہ نام است دنیا، چہ نام است عقبٰی
تو معمار این خانہ ھای گمان را

میرزا بیدل کے کلام میں مطالعۂ کائنات کی دعوت عام ہے۔ ان کی نظر میں پوری کائنات صرف حسین و عظیم ہی نہیں بلکہ خالقِ حسن و عظمت کا بھی پتا دیتی ہے۔ اشعار کے علاوہ اپنی کتاب چہار عنصر میں جو نثر میں ہے اس مضمون کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک نثر پارے کے چھوٹے سے حصے کا ترجمہ پیش ہے: ''ذرا غور تو کیجئے مطلع خورشید،

دیوان مشرق کا ترجیع بند کیوں ہوا' ذرا سوچئے مصرع ہلال' کتاب مغرب کی بسم اللہ کیسے بنا' تم نے سواد سینۂ نگں چیر کر نہیں دیکھا اور نہ معلوم ہو جاتا کہ یہ زمین کس کے عالم تقریر کا مسودہ ہے اور قطعہ بہار کی رنگ آمیزی تک نہ پہنچے ورنہ تم جان لیتے کہ بادل کس کی شوخی تحریر ہے' کائنات کی ہر چیز دعوت فکر دے رہی ہے۔ فلک اپنی گردش سے زوال مراتب فطرت کی نشان دہی کر رہا ہے اور زمین اپنی پستی سے عبرت کا درس دے رہی ہے کہ بے عملی اور درماندگی بے ہمتی کی دلیل ہے''۔

میرزا بیدل نے حقائق حیات اور مسائل انسانی کی ترجمانی نہایت ژرف نگاہی اور سوز دلی کے ساتھ کی ہے اور ایک صورت میں تو ان کی اولیت تمام شعرائے فارسی زبان پر مسلّم ہے کہ انہوں نے معاشرے کے چھوٹے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ قصاب' حجام' کمہار وغیرہ کے پیشوں کی اہمیت کو واضح کیا' ان پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اور ان کو حقیقی احترام وعزت کا سزاوار قرار دیا۔ بیدل نے زمانے کے چلن اور فارسی شاعری کی روایت کے برعکس شاہانِ وقت کی قطعاً مدح سرائی نہیں کی' کسی حاکمِ وقت کی شان میں ایک مصرع بھی نہیں کہا' شہزادہ عالم شاہ نے قصیدہ کی فرمائش کی تو بجائے قصیدہ کے ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف حکمرانانِ وقت پر تنقید کی بلکہ خود وجود بادشاہت اور ملوکیت کے ادارہ کو بھی موضوع تنقید بنایا ہے۔ میرزا بیدل کی نظر میں بادشاہ اور ڈاکو میں کوئی فرق نہیں' یہ عوام کو لوٹ کر اور (خاص طور پر دورِ تہذیب وتمدن کے آغاز میں) کاشتکاروں کے کھلیانوں پر قبضہ کر کے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ انہی میں سے فرعون ونمرود ہیں' جنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا:

جوشِ فرعون و شوخیِ نمرود
ہر طرف بال اقتدار کشود

رایگان بود ساز جاہ و حشم

مفت شد دعویِ خدائی ہم

(مثنوی عرفان)

یہ لوگ اگر عادل بھی ہیں تب بھی ظالم ہیں کہ یہ لوگ عدل کر کے عوام میں امن اس لئے قائم کرتے ہیں تاکہ خراج کی وصولی میں اضافہ ہو امن ہوگا تو زراعت اور تجارت و صنعت کی ترقی ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں زیادہ خراج یا ٹیکس ملے گا۔ ورنہ یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے سینکڑوں لوگوں کے قتل کرنے کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ میرزا بیدل نہ صرف بادشاہوں کو بلکہ اہلِ دولت و ثروت کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ مثنویوں اور غزلوں میں بادشاہوں اور دولت مندوں پر خوب تنقید کی ہے۔ ایک جگہ میرزا بیدل کہتے ہیں کہ دولت مند کبھی آگہی حاصل نہیں کر سکتے، بھلا کہیں مخمل بھی خواب سے بیدا ہوتا ہے:

منعم و آگہی چہ امکان است

مخمل از خواب کی شود بیدار

ایک شعر میں دولت مندوں کو قارون کہا ہے:

منعمان تا چند باید زر بزیرِ خاک برد

حیف ہمتہا کہ صرفِ خدمت قارون کنید

میرزا بیدل نے اپنے کلام میں بڑی ہی دردمندی سے ملکی حالات، مسلمانوں کے زوال اور عوام کی بدحالی کا ذکر کیا ہے۔ عوامی مسائل کو جس شرح و بسط کے ساتھ انہوں نے پیش کیا ہے کم از کم فارسی شعروادب کی تاریخ میں ان سے پہلے ایسی مثال ناپید ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی عوامی شاعر ہے۔ جس نے عوام کے دکھوں کو صفحہ قرطاس پر پیش کرنے کے لئے خون دل میں اپنی انگلیاں ڈبو لی ہیں۔ ایک قطعہ میں حکمرانان وقت کو

متنبہ کرتے ہیں کہ اس آگ سے ڈرو جو عوام کے ذہنوں میں پلتی ہے اور ان کے دلوں سے بھڑکتی ہے یہ غبار (آگ) اگر جمع ہو جائے تو برق سوزاں سے زیادہ شعلہ بار اور خوفناک ہوتا ہے:

الحذر آن تندیی کز طبعِ مردم گل کند
اتفاقِ این غبار از برق ہم سوزان تر است

عاجز اور کمزور عوام کے ہجوم و حملے سے غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ مسکین چیونٹیاں جب باہم مل کر حملہ کرتی ہیں تو اژدھے کی طرح خطرناک ہوتی ہیں:

از ہجومِ عاجزان غافل نباید زیستن
مورِ مسکین ہر کجا جوشید باہم اژدر است

عوام کے جوش کے سامنے نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ آگ جب بھڑک اٹھے تو سب خشک و تر کو جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے:

امتیازِ نیک و بد محواست در جوشِ عوام
چوں بلند افتاد آتش خشک و تر خاکستر است

ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے سے باز رہو کیونکہ ہمارے زمانے میں پتھر دادرس ہے اور مینا دادخواہ ہے:

گر سلامت خواہی از سازِ تظلم دم مزن
دادرس در عہدِ ما سنگ است و مینا داد خواہ

یہ چھوٹا سا مصرع کہ "دادرس در عہد ما سنگ است و مینا دادخواہ" ایک جہان معنی بلکہ تلخ حقائق اور لطیف طنز کی دنیا لئے ہوئے ہے۔ ایک شعر میں میرزا بیدل نے بڑی ہی پتے کی بات کہی ہے کہ آج دنیا کے سارے انسان عدل و انصاف کو اپنا شعار بنالیں تو کوئی

بھی حضرت مہدیؑ اور دجال کا منتظر نہ رہے:

امروز اگر انصاف دہد دادِ طبائع
کس منتظرِ مہدیؑ و دجّال نباشد

ایک شعر میں میرزا بیدل نے مسلمانوں کے سیاسی زوال اور اخلاقی انحطاط پر اپنے دلی دکھ کا اظہار کیا ہے کہ جب ہم حضورِ قلب سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو آیاتِ قرآنی کی لفظی و معنوی خوبیاں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں لیکن جب تفسیر کرتے ہیں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں یعنی تفسیر کے وقت اپنی بدعملی اور بدعملی کے نتیجہ میں ملی بدحالی کو دیکھ کر پشیمان ہو جاتے ہیں:

بیدل آن قرآن کہ درسِ حضورش خواندہ ایم
متنِ آیاتش تحیر دارد و تفسیر شرم

میرزا بیدل غزل گوئی میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ فن کے حوالے سے بھی اور معانی و مطالب کے لحاظ سے بھی تمام فارسی غزل گو شعرا میں ان کی حیثیت منفرد ہے۔ اگرچہ فارسی غزل کا آغاز تو رودکی (جسے فارسی شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں) سے بہت پہلے ہو چکا تھا___ محمود وراق ہروی (وفات ۲۲۱ھ)، فیروز مشرقی اور حنظلہ بادغیسی کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو غزل سے بہت قریب ہیں___ لیکن اصطلاحی معنوں میں فارسی غزل رودکی (وفات ۳۲۹ھ (صفا)) کے ہاں ملتی ہے، یعنی غزل اپنی پوری ہئیت ترکیبی کے ساتھ مطلع، مقطع اور تخلص وغیرہ لئے ہوئے اسی کے کلام میں موجود ہے، یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ غزل کا آغاز رودکی ہی سے ہوا۔ فارسی غزل نے رودکی (وفات ۳۲۹) سے میرزا بیدل (ولادت ۱۰۵۴ء) تک ایک طویل سفر طے کیا ہے تقریباً اس سات سو سال کے عرصے میں فارسی غزل نے بہت سے رنگ دیکھے، بہت سے

چولے بدلے، بہت سے انداز اختیار کیے۔ ابتداء میں یعنی تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک فارسی غزل سادہ عشقیہ مضامین کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ غزل میں الفاظ و افکار بھی سادہ اور تشبیہات و استعارات بھی سادہ ہوتے تھے۔ سنائی نے غزل کو عرفان وتصوف سے آشنا کیا۔ یہ روایت عطار، عراقی، رومی اور سعدی سے ہوتی ہوئی حافظ شیرازی تک پہنچتی ہے۔ ساتویں صدی میں سعدی نے ایک نئی روایت کو جنم دیا۔ سعدی تجرباتِ عشق سے بہرہ ور تھے، انہوں نے عشق ومحبت کے اظہار کے لئے غزل کو جذبے کی سچائی اور دل کا سوز عطا کیا۔ یہ روایت بھی حافظ شیرازی کے ہاں کمال کو پہنچی۔ حافظ نے غزل کو الفاظ و معانی اور جذبات وافکار کا ایک تاج محل بنا دیا۔ غزل کا یہ اسلوب اس قدر بلند ہے کہ ایک ڈیڑھ صدی تک اس سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا، اسی اسلوب کو حرفِ آخر سمجھا گیا تا آنکہ فغانی نے ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی جسے وقوع گوئی کہتے ہیں اسی سے سبک ہندی وجود میں آیا۔ یہ تھی فارسی غزل کی صورت بیدل سے پہلے۔ میرزا بیدل کی نظر میں تمام استاد شعرا کا کلام تھا۔ ایک روایت کے مطابق اساتذہ شعرائے فارسی کے کلام کا انہوں نے گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے کا اثر میرزا بیدل کے کلام پر یقیناً ہے۔ بالخصوص سبک ہندی کے اثرات ان کے کلام میں نمایاں ہیں یعنی خیال بندی وتازہ گوئی، تشبیہات و استعارات نادرہ اور ارسال المثل کا استعمال، پند و حکمت کا بیان، لمبی لمبی ردیفوں کا لانا، غیر جاندار کو جاندار فرض کرنا اور نئے نئے مضامین تراشنا۔ اساتذۂ شعرائے فارسی کے یہ تمام اثرات ان کے کلام میں موجود ہیں لیکن ایک لحاظ سے میرزا بیدل کا مقام منفرد ہے۔ یہ انفرادیت غزل کی ہیئت کے لحاظ سے بھی ہے اور معانی ومطالب کی حیثیت سے بھی۔

غزلِ بیدل
کی
فنی اور فکری جہتیں

شاعر غزل میں اپنے ذاتی تجربوں کو پیش کرتا ہے' اس کا دل پر اسرار کیفیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک بلند پایہ غزل گو تخیل اور جذبے کی آمیزش سے اپنی اندرونی کیفیات و تجربات و احساسات کو اس سحر آگین طریقے سے ایک خارجی وجود مہیا کرتا ہے کہ ہر شعر شاعر کی اندرونی دنیا کا ایک رمزیہ اشارہ بن جاتا ہے اور یہی رمزیت یا ایمائیت غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے' ویسے بھی نقادانِ فن کی نظر میں ایمائیت یا رمزیت تو آرٹ کی معراج ہے' ہاں اس سلسلے میں ایک بات خاص طور پر اہم ہے کہ تعقید معنوی یا دقت پسندی اور ایمائیت و رمزیت میں ایک فرق ہے۔ تعقید در حقیقت ایک شعری عیب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کے ابلاغ میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تعقید میں شعر کا کوئی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا سوائے خیالی گھوڑے دوڑانے کے۔ غالب کے اردو کے اس شعر کا مفہوم آج تک واضح نہ ہو سکا' اسی لئے علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں اپنے خیالی آسمانی سفر کے دوران فلک مشتری پر خود غالب سے ملاقات کے وقت ان سے اس شعر کی تشریح چاہی:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

رمزیت ابلاغ کامل کی بھی ایک صورت ہے' شاعر جب زندگی کے کسی جذباتی تجربے یا لطیف احساس کو جسے وہ اپنے شعور یا تحت الشعور کے تہہ در تہہ پردوں سے نکال کر شعر کی صورت میں خارجی خاکہ مہیا کرتا ہے تو اس میں رمزیت کا پہلو بھی آ سکتا ہے' چونکہ شاعر اپنے تجربے یا احساس کو اس کے تمام مختلف اور وسیع پہلوؤں کے ساتھ دو مصرعوں کی مختصر حدود میں سمو کر پیش کرتا ہے۔ بیدل کے کلام میں رمزیت کا یہ پہلو عام ہے۔

ایہام گوئی کا عام انداز یہ ہے کہ شاعر ایک ایسا لفظ استعمال کرتا ہے جو دو معنی رکھتا ہو' ایک معنی قریب' ایک معنی غریب اور شاعر بجائے معنی قریب کے معنی غریب مراد لیتا ہے لیکن میرزا بیدل کا اسلوب یہ ہے کہ شعر میں ایک ایسا لفظ لاتے ہیں جو کئی معنی رکھتا ہو اور یوں اسے دوسرے لفظوں کے ساتھ جڑتے ہیں کہ ہر معنی اس شعر میں اپنی بہار دے رہا ہوتا ہے' ان کا ایک شعر ہے:

زسازِ محفلِ تحقیق این آواز می آید
کہ ای آہنگ یکتائی ازین نُہ پردہ عریاں باش

اس شعر میں ''نُہ پردہ'' ذو معنیین ہے یعنی ''نُہ پردہ'' کے دو معنی ہیں (۱) نو آسمان (۲) نو راگ) اور دونوں ہی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کی غزل میں یہ معنوی ہمہ جہتیت میری نظر میں فیضِ قرآنی ہے۔ قرآن پاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ اپنی تمام معنوی جہتوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں جیسے اس آیت ''الشمس و القمر بحسبان و النجم و الشجر یسجدان'' میں ہے یہاں نجم کے معانی شمس و قمر کی نسبت سے ستارہ بھی ہو سکتے ہیں اور شجر کی نسبت سے پودا ہیں' دونوں معانی اپنی بہار دے رہے ہیں۔

قرآن پاک نے مسلمانانِ عالم کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا اور ادب و شعر بھی اس کے اثرات کے تحت آئے۔ تمام اصناف سخن میں ایک لحاظ سے غزل کی ہیئت قرآنی

آیات کے زیادہ قریب بلکہ غزل کی ظاہری ساخت اور اس کا وجود غالباً آیات قرآنی ہی کا مرہون منت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزل کا وجود غیر مسلم ادب میں نہیں۔ قرآنی آیات چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل خوبصورت اور دلکش الفاظ سے مزین اور اپنے اندر معانی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں اور ہر آیت عام طور پر ایک مکمل اکائی ہوتی ہے۔ بظاہر دوسری آیات سے علیحدہ لیکن بہ معنی مربوط۔ کچھ ایسی ہی صورت ایک اچھی غزل کی بھی ہوتی ہے۔ اس کے مختلف اشعار بظاہر علیحدہ معانی کے حامل ہوتے ہیں، ایک نیا جہان معنی لئے ہوئے لیکن بباطن تمام اشعار باہم مربوط ایک ہی جذبے یا احساس کے عکاس۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کی ایک خصوصیت اس کا اپنا ایک آہنگ ہے ___ موسیقی سے بھی زیادہ بلند، پاک اور مسحور کن ___ اچھے غزل گو شعرا کے کلام میں بھی یہ آہنگ یا غنائیت ہوتی ہے۔ فارسی غزل گو شعرا میں حافظ، غالب، بیدل اور علامہ اقبال کا کلام اسی آہنگِ خاص کا حامل ہے۔

نیز یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کا ایک اسلوب تقابل معانی بھی ہے یعنی اگر ایک بات کی وضاحت ہو رہی ہے تو ساتھ ہی جو اس سے متقابل بات ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اگر جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہے تو دوزخ اور اس کی زحمتوں کا بیان بھی ہے، اسی طرح اصحاب یمین کے ذکر کے ساتھ ساتھ اصحاب شمال اور نور کے ذکر کے ساتھ ساتھ ظلمت کا بھی ذکر ہے، تاکہ قاری کے ذہن پر اس تقابل معانی کے بیان سے حقیقت حال صحیح معنوں میں منقش اور مرتسم ہو جائے اور اس کے دل میں بھی اتر جائے ___ غزل میں بھی بعض شعرا نے اور خاص طور پر علامہ اقبال اور بیدل نے اس تقابل معانی کا التزام کیا ہے۔ غزل میں ارسال المثل کا استعمال بھی قرآن حکیم کے تمثیلی اسلوب ہی کا ایک عکس معلوم ہوتا ہے جو بیدل کے کلام میں عام ہے۔ قرآن حکیم میں ہر لفظ ہر جگہ ہیرے کی طرح جڑا ہوا ہے اور فصاحت و بلاغت کی جان ہے۔ کمال بلاغت و فصاحت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ صوتی

اور معنوی اعتبار سے ملتے جلتے الفاظ ایک ہی آیت میں آتے ہیں جو بلاغت کلام اور شیرنی بیان میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں مثلاً بئس الورد المورود (۱۱_۹۸) قواریرا من فضته قدروھا تقدیرا (۷۶_۱۶) و کان امر اللہ قدراً مقدورا (۳۳_۳۸) بعض شعرا اور خاص طور پر بیدل نے بھی اس کا اہتمام کیا ہے' اگرچہ قرآن حکیم ایسی فصاحت و بلاغت تو نہ پیدا ہو سکی البتہ غزل میں بیان کی شیرینی تو آ ہی گئی ہے۔

غزل کا رمزیہ یا ابہامی انداز کچھ اہل فن کی نظر میں پسندیدہ نہیں اور سبک ھندی کے حوالے سے ایرانی نقادوں نے اس پر شدید تنقید بھی کی ہے' اور خاص طور پر اس ضمن میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران میں بیدل کو نشانہ تنقید بنایا ہے اور ان کے مندرجہ ذیل شعر کو بے معنی خیال کیا ہے:

نزاکتہا است در آغوشِ مینا خانہ حیرت　　　مژہ برہم مزن تانشکنی رنگ تماشا را

اور خاص طور پر کہا ہے کہ "رنگ چگونہ رنگی است و آن را چگونہ می شکنند" یعنی "رنگِ تماشا" کیسا رنگ ہے اور اُسے کیسے توڑتے ہیں یا ختم کرتے ہیں (ذبیح اللہ صفا' تاریخ ادبیات در ایران، ج ۵' ص ۴۳۹) ___ حالانکہ یہ شعر بہت بلند معانی کا حامل ہے۔ اس شعر کا نثر میں ترجمہ تو یوں ہے کہ (جلوہ ہائے محبوب کے) مینا خانہ حیرت کی آغوش میں نزاکتیں ہی نزاکتیں ہیں' پلک بھی مت جھپکیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رنگ تماشا ٹوٹ جائے' یہاں رنگ کے معنی رونق کے ہیں جیسا کہ فردوسی کے اس شعر میں ہے:

به خانه در آی ار جهان تنگ شد
همه کار بی برگ و بی رنگ شد

لفظ رنگ کے معنی علاوہ کسی چیز کی ظاہری صورت کے جیسے سرخ و سبز وغیرہ کے اور بھی معانی

ہیں___ رنگ کے معانی رونق' رواج' فائدہ' حصہ' مکروحیلہ اور فریب بھی ہیں۔ (فرہنگ عمید)

اس شعر میں مژہ برہم مزن یا ''پلک مت جھپک'' سے مراد ہے غفلت یا بے توجہی سے پرہیز کرو یعنی محبوب کے حضور ہمہ تن متوجہ رہو کیونکہ اس کی بارگاہ میں غفلت بہت بڑا جرم ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ بارگاہ حسن میں جہاں حیرت انگیز جلوؤں کا مینا خانہ ہے وہاں عاشق کو ہمہ تن جلوہ ہائے محبوب میں مصروف اور محو دیدر رہنا چاہئے کیونکہ اگر ذرا سی بھی غلفت برتی تو محبوب جو بہت ہی نازک مزاج ہے برہم ہو جائے گا' نظارۂ جمال کا رنگ یعنی رونق ختم ہو جائے گی اور یہ منظر حسن درہم و برہم ہو جائے گا۔ اس شعر میں مناسبات بھی ہیں جنہوں نے اس شعر کو دلکش اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے' مینا خانہ کی نسبت سے نزاکت' حیرت اور آغوش کے الفاظ شعر کی معنویت کو اجاگر کر رہے ہیں' تماشا کی نسبت سے لفظ مژہ لایا گیا ہے۔ لیکن ان مناسبات لفظی میں تکلف نہیں بے ساختہ پن ہے بلکہ یہ تو ابلاغ کامل کی ضرورت ہیں۔ مینا خانہ حیرت مختلف معانی کی دلالتیں لئے ہوئے ہے۔ یہ مینا خانہ حیرت محبوب مجازی کی جلوہ گاہ بھی ہو سکتا ہے اور محبوب حقیقی کی بارگاہ بھی' میخانہ بھی ہو سکتا ہے اور مسجد بھی' حضور حسن بھی اور حضور حق بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ جہان رنگ و بو یہ دنیائے معاملات بھی تو مینا خانۂ حیرت ہے جہاں پر انسان کو ہر قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کسی کے آبگینہ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے' یہ آبگینے تو اتنے نازک ہیں کہ صرف ایک پلک کے جھپکنے سے ٹوٹ سکتے ہیں یا یوں کہیے کہ انسان کی ذرا سی غفلت سے کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ سو اس شعر کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ نازک مزاج محبوب اپنے حضور میں ذرا سی غفلت یا بے توجہی کو برداشت نہیں کرتا اور فوراً اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور سارا بنا بنایا منظر یا تماشا بکھر جاتا ہے اور صوفیہ کے مسلک میں مقام حضوری میں خواطر پر بھی پوری طرح نظر رکھنی پڑتی ہے' یہ مفہوم بھی اس شعر میں موجود ہے۔ میر نے اردو میں کہا تھا:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

بیدل کا یہ شعر میر کے شعر کا مفہوم بھی لئے ہوئے ہے۔

بیدل کے اشعار میں یہ رعنائی افکار، یہ معانی کی رنگارنگی، یہ رمزیت کا انداز عام ہے اور یہ رمزیت کا انداز اس کے اشعار میں جو بظاہر مبہم نظر آتے ہیں اس لئے ہے کہ وہ اپنے احساس یا فکر کے مختلف دقیق پہلوؤں کو ایک شعر کی تنگنائے میں پیش کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کی کامل تصویر سامنے آ جائے، یہ اس کا کمال فن ہے، ابلاغ کامل ہے، یہ تعقید معنوی یا دقت پسندی نہیں۔

اسی طرح بیدل کا ایک اور شعر ہے:

درین چمن کہ ہوا داغ شبنم آرایی است تسلیی بہ ہزار اضطراب می بافند

اس شعر میں چمن سے مراد جہان ہے، ہوا زندگی کی علامت ہے کہ چمن کی نشو و نما اور اس کی بہار ہوا پر ہے۔ داغ سے فنا مراد ہے۔ شبنم آرایی بھی زندگی اور اس کی رونق کی علامت ہے۔ قطرۂ شبنم خود بھی زندگی کا نشان ہے اور شبنم آرایی چمن کی زینت ہے، ویسے خود شبنم حیا اور شرم کی بھی علامت ہے۔ تو مفہوم یہ ہوا کہ اس چمن دنیا میں ہوا جو خود چمن کی زندگی کا سبب ہے شبنم آرائی کی موت ہے کہ ہوا چلتی ہے تو شبنم کے قطرے گر جاتے ہیں یا ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور یوں فنا ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تسلی ہزار اضطراب کے ساتھ بُنی ہوئی ہے۔ بیدل نے اس شعر میں دو حقیقتوں کو پیش کیا ہے (۱) غم و راحت ساتھ ساتھ ہیں (۲) ایک کی زندگی دوسرے کی موت ہے، اس کے علاوہ شادی و غم توام نہیں کہا بلکہ بافتہ کہا ہے، جو زیادہ مناسب ہے۔ اور اس شعر کا ایک مفہوم صوفیانہ رنگ میں یہ ہے کہ ہوا یعنی خواہش نفسانی شبنم آرائی یعنی روحانی زندگی کی موت ہے گویا ہوا یا خواہش کے

پورا ہونے میں ایک گونہ مادی راحت تو ملتی ہے لیکن روحانی اور آخرت کی ہزاروں بے چینیاں اس سے وابستہ ہیں___ یہ شعر بھی اسی نوع کا ہے:

غبار ہر ذرہ می فروشد بحیرت آئینۂ تپیدن
رم غزالان این بیابان پی نگاہ کہ می خرامد

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے خداوند تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں مصروف ہے اور ہر شے کی اس حکم برداری پر اس جہان کا ذرہ ذرہ محو حیرت ہے لیکن اسے کہا یوں کہ ہر ذرہ کا غبار حیرت سے تڑپ (بے چینی) کا آئینہ بنا ہوا ہے (یعنی تڑپ رہا ہے' بے چین ہے) کہ دشت و بیابان کے ہرن نجانے کس کی نگاہ کے تعاقب میں رواں دواں ہیں یا محو خرام ہیں۔ غبار' آئینہ' حیرت' دشت' غزال' نگاہ کی مناسبتوں نے اس شعر کو اور زیادہ پر معنی' فکر انگیز اور دلنشین بنا دیا ہے۔ ذرہ کی چمک اور جھلک سے آئینہ اور تپیدن کا تصور ابھرتا ہے سو آئینہ اور تپیدن لائے گئے ہیں' رم آہو اور ذرہ کے حوالے سے لفظ غبار نے اور معنویت میں اضافہ کیا کہ غبار (گرد) کسی کے وجود کی خبر بھی دیتا ہے جیسا کہ یہ مصرع ہے ؎

تو چہ دانی کہ درین گرد سواری باشد

گرد اور سوار کے باہمی ربط کی روایت بھی فارسی شاعری میں موجود ہے۔ ذرہ کا غبار سے ایک تعلق ہے کہ ذرے ہی سے غبار وجود میں آتا ہے۔ ذرا خیال کیجئے انسان خود بھی تو خورشید حق کے مقابلے میں مانند ذرہ ہے بلکہ اس سے بھی کم ہے. جس کا وجود خالق کے وجود کا پتا دے رہا ہے۔ انسان کا وجود خدا کے موجود ہونے کی نشانی ہے۔ آئینہ کا تعلق حیرت سے ہے' یہ بھی فارسی شاعری کی روایت ہے' ذرہ کی چمک آئینہ سے مشابہ ہے اور ذرہ کی جھلک ایک تڑپ کا استعارہ ہے۔ پھر یہ بات کہ اس دشت (کائنات) کے غزال کس غزال چشم محبوب کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں' اس سوال ہی میں خود جواب بھی پنہاں ہے کہ کائنات کی

ہر چیز حسین ہے جو ایک حسین (خدا) کی نگاہ کے حکم کی تابع ہے، کسی کو بھی اس کے حکم سے سرتابی کرنے کی مجال نہیں، ہر چیز بالطبع اس کی تابع فرمان ہے۔

بیدل خدا مست شاعر ہیں ان کے ہاں ایسے خوبصورت اشعار جو حمد حق اور عشق حق کا پہلو لئے ہوئے ہیں بہت زیادہ ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں حمد حق اور عشق حق کے مطالب کا امتزاج دیدنی ہے:

نفس از تو صبح خرمن، نگہ از تو گل بدامن　　تو آنکہ در بر من، تہی از من ست جایت

بہ بہار نکتہ سازم، ز بہشت بی نیازم　　چمن آفرین نازم، بہ تصور لقایت

یعنی سانس تجھ سے ہی خرمن کی صبح ہے اور تجھ ہی سے نظر گل بدامن ہے، تو جو میری آغوش میں ہے تیری جگہ مجھ سے خالی ہے۔ بہار سے نکتہ سازی کرتا ہوں میں جنت سے بے نیاز ہوں، میں ناز کا چمن پیدا کرتا ہوں صرف تیرے چہرے کے تصور سے۔

غزل کی عمارت جذبات انسانی ہی پر استوار ہوئی ہے، جذبہ غزل کا بنیادی عنصر ہے، جذبہ انسانی جبلت کا ایک تقاضا ہے لیکن یہ جبلی تقاضا، یہ جذبہ اگر انسان کو رفعت اور بلندی عطا کرے تو یہ صالح ہے اور اگر پستی اور شرمندگی کا سبب بنے تو یہ فاسد ہے۔ اچھی شاعری یا اچھی غزل وہی ہے جو صالح جذبوں کی ترجمان ہو جو قاری کو رفعت عطا کرے، وہ محسوس کرے کہ میں عرش انسانیت کے قریب ہوا ہوں۔ اگر قاری غزل کو پڑھ کر خواہ وہ کتنی ہی بڑی فنی حیثیت رکھتی ہو خود سے شرمندگی محسوس کرے یا وہ اس کے فاسد جذبوں کو ابھارے، وہ انسان کے نصف اسفل کی شاعری ہے اور اگر قاری اسے احساس فخر کے ساتھ پڑھے، دل میں دردمندی کا جذبہ ابھرتا اور خود کو دوسرے سے بلند تر ہوتا محسوس کرے تو وہ یقیناً صدائے دل ہے اور روح کی آواز ہے اور وہ غزل ادبیات عالیہ میں جگہ پانے کے

لائق ہے۔ بیدل کی بیشتر غزلیات اسی انداز کی حامل ہیں۔

غزل کی دنیا میں خیال، تخیل اور فکر کی اہمیت بھی مسلم ہے، خیال انسانی ذہن کی وہ صلاحیت ہے جو تجربات و محسوسات کو تحت الشعور اور لاشعور کی دنیا سے شعور کی دنیا میں منتقل کرتا ہے۔ خیال ذہن انسانی کی لہر ہے جس میں اگر جذبے کا عنصر موجود ہو تو تخیل ہے اور اگر یہ خیال منظم اور مرتب شکل میں ہو اور منطقی استدلال کی بنیادوں پر استوار ہو تو یہ فکر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خیال اپنی جگہ پر اہم ہے کہ زندگی کا کارخانہ بہت حد تک خیال ہی پر مبنی ہے بقول مولانا رومی:

تو جہان رابر خیالی بین روان

جسے بیدل نے یوں کہا ہے:

زعدم جدانہ فتادہ ای رہ دیگری نکشادہ ای
مگراین کہ پیش خیال خود بہ خیال آمدن آمدی

خیال بندی فارسی غزل کی ایک مسلمہ روایت بھی ہے اور یوں خیال کو فارسی غزل میں اہمیت حاصل ہے، اس کے علاوہ ایک خوبصورت فکر کی عکاسی بھی غزل کے شعر کو رفعت اور بلندی عطا کر دیتی ہے، یوں غزل میں فکر کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن غزل میں تخیل کی کارفرمائی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ تخیل ان خیالات اور معلومات کو جو حواس کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتی ہیں ایک نئے رنگ، ایک نئی تصویر اور ایک نئی صورت میں ڈھال دیتا ہے اور ان غیر مرئی حقائق کو جو حواس انسانی کی گرفت میں پوری طرح نہیں آپاتے، ہمارے سامنے منقش کر دیتا ہے۔ خیال کا کام ذہن پر مرتب شدہ نقوش کی باز آفرینی ہے، فکر کا کام تصور سازی ہے اور تخیل کا کام تصویر گری ہے۔ تشبیہ ہو یا استعارہ تجسیم ہو یا کنایہ سب خیالی تصویر آفرینی میں ممد و معاون ہوتے ہیں، جو درحقیقت تخیل ہی کی کرشمہ

سازی ہے۔

جدت ادا کا حسن اور حسن ادا کی خوبی دونوں بہت حد تک تخیل ہی کی رہین منت ہیں۔ جدت ادا، درحقیقت انداز بیان میں تخیل کے زور پر نیا پن پیدا کرنا ہے اور حسن ادا، انداز بیان میں ایمائیت اور تصویر گری سے تیکھا پن پیدا کرنا ہے۔

فارسی غزل میں تخیل کی کارفرمائیاں مختلف رنگ کی ہیں، کہیں یہ مضمون آفرینی ہے یعنی خیالات وتصورات بدیع یا معانی وافکار بلند کو تخیل کے زور پر خیالی تشبیہوں یا نئے استعاروں یا کنایوں کے ذریعے شعر میں اس طرح سمو دیا جائے کہ سننے والا اسے سن کر پھڑک اٹھے۔ اس انداز شعر گوئی کو خیال بندی یا تازہ گوئی بھی کہتے ہیں اور بقول ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا چونکہ تخیل کے استعمال میں مبالغہ کیا جاتا ہے یا شعر میں لطیف نکتہ تراشی پر تکلف کوشش کی جاتی ہے، اس لئے بعض شعرا کا کلام ناقابل فہم بن جاتا ہے۔

شعر گوئی کے اس رنگ نے جو بہت حد تک تخیل کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا، خوبصورت تراکیب تراشنے کا رواج بھی ڈالا۔ چونکہ شاعر کو بہت سے مضامین اور خیالات ایک مختصر سے شعر میں سمونے ہوتے ہیں اس لئے لازم ہوا کہ ایسے الفاظ لائے جائیں جو مختصر ہوں لیکن بہت سے معانی کے حامل ہوں، سو ترکیب سازی کی روش پڑی، زلالی خوانساری نے تخیل کے زور پر بہت سی نئی تراکیب ایجاد کیں اور چونکہ اس نے تخیل کا کچھ زیادہ ہی استعمال کیا، اس لئے کچھ تراکیب خیال بافی کا نمونہ بن گئیں مثلاً ''غنچہ خواہ دشت''، یعنی وہ شخص جو جنگل میں کلی توڑنے کے لئے یا کلی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہو، یہ روایت ترکیب سازی دوسرے فارسی شعرا نے بھی اپنائی اور خاص طور پر بیدل نے اس میں کمال پیدا کیا۔ بیدل کی تراکیب نہایت خوبصورت، فکر انگیز اور وسیع معنوں کی حامل ہوتی ہیں مثلاً دل گداختہ، گداز درد، اکسیر بے نیازی، محیط شرم، زبان حیرت آئینہ، مست کرم، سراب وہم، دماغ

آرزو، چراغ انتظار، برق بلا، کرسی اندیشہ، چشم آئینہ، شعلۂ ادراک، شبنمستان خیال، فانوس خیال، سراغ فہم، چراغ آشنائی۔

تازہ گوئی ہو یا مضمون آفرینی، خیال بندی ہو یا نازک خیالی ان سب کی بنیاد تخیل اور توہم پر ہے۔ خواہ استعارہ ہو یا کنایہ، تمثیل ہو یا تجسیم غزل گو شاعر ان سب کو تخیل کے زور پر خوشرنگ تراکیب کے سانچے میں ڈھال کر اپنے تہہ دار خیال یا فکر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کے تمام پہلو ایک شعر میں سما جائیں اور اس سے بعض اوقات ابہام یا تعقید پیدا ہو جاتی ہے جسے مشکل پسندی یا دقت پسندی بھی کہا جا سکتا ہے۔

تخیل کا ایک رنگ غزل میں تخیلی یا تمثیلی استدلال ہے جو منطقی استدلال سے مختلف ہے۔ اسی تخیلی استدلال کی طرف نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالے میں یوں اشارہ کیا ہے:

''شاعری صناعتی ست کہ شاعر بدان صناعت اتساق مقدمات موھومہ کند و التیام قیاسات منتجہ را بر آن وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد د نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند''۔

یعنی شاعری ایک ایسا فن ہے کہ شاعر اس فن سے وہمی یا خیالی مقدمات یا نتیجہ خیز قیاسات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ چھوٹی سی بات کو بڑی یا بڑی بات کو چھوٹی یا اچھی بات کو بری یا بری بات کو اچھی بنا دیتا ہے۔

بیدل بھی تو یہی کہتے ہیں:

صنعتی دارد خیال من کہ در یکدم زدن　　　عالمی را ذرہ سازم، ذرہ را عالم کنم

یعنی میرا خیال ایسی صنعت رکھتا ہے کہ ایک لمحہ میں ایک عالم کو ذرہ اور ایک ذرے کو عالم بنا دیتا ہوں۔

یہ تخیلی استدلال شاعر کے ہاتھ میں بہت بڑا ہتھیار ہے جس سے وہ حقائق کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور اس کے اس مخصوص نقطہ نظر میں جسے وہ تخیلی استدلال کے ساتھ پیش کرتا ہے، قاری بھی خود کو شریک سمجھنے لگتا ہے۔ اس تخیلی یا تمثیلی استدلال سے بعض اوقات شعرا نے زندگی کے بہت سے لاینحل مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے مثلاً متکلمین اور متصوفین کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے کائنات تخلیق نہیں کی کیونکہ اگر تخلیق کرتا تو وہ شے جس سے اس نے عالم کو تخلیق کیا اس کی ذات سے ماورا ہوتی اور ازلی بھی ہوتی۔ سو دو وجود ازلی ہوتے، ایک خدا کا اور ایک اس شے کا جس سے کائنات تخلیق ہوئی ہے، اس سے شرک لازم آتی ہے۔ اس مسئلے کا حل تصوف میں تنزلات کے نظریے سے پیش کیا گیا ہے یعنی کائنات خلق نہیں ہوئی بلکہ بروز ہوئی ہے اور یوں کائنات خدا کی ذات ہی کا ظہور یا بروز ہے اور خدا نے یہ ظہور یا بروز مختلف درجوں میں کیا ہے جسے تنزلات خمسہ یا تنزلات ستہ کہتے ہیں یعنی عرش و کرسی سے خاک تک، خورشید سے ذرے تک سب خدا کی ذات ہی کا ظہور ہے۔ تنزلات کے سلسلے میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے مقام احدیت سے مقام مادیت تک یا عرش سے عناصر تک نزول فرمایا تو اس نزول میں خداوند تعالیٰ مقام احدیت یا مقام عرش پر موجود نہ ہوا۔ چونکہ جب کوئی شخص ایک منزل سے دوسری منزل میں آتا ہے تو اس کا وجود پہلی منزل پر نہیں ہوتا، لیکن یہ بھی ہے کہ خدا کے بارے میں ایسا کہنا یا سوچنا کفر ہے، ہمارا ایمان ہے کہ وہ بیک وقت مقام احدیت میں بھی ہے اور اسی طرح مقام جسمیت یا مادیت میں بھی موجود ہے لیکن اس بات کی عقلی دلیل موجود نہیں تھی، بیدل نے اس کا استدلال یوں پیش کیا ہے کہ تنزل کا نشو و نما بالکل ایسا ہی ہے جیسے سر کے بال پاؤں تک پہنچ جائیں کہ وہ بیک وقت سر پر بھی موجود ہوتے ہیں اور پاؤں پر بھی ___ گویا ذات حق کا مختلف منازل میں بیک وقت موجود ہونا

ایسا ہی ہے جیسا کہ سر کے بال ہیں جو بیک وقت سر پر بھی ہیں اور بڑھتے بڑھتے پاؤں تک بھی پہنچ جاتے ہیں:

فهمیدنی ست نشو ونمای تنزلت　　　　یعنی چو موی سر به تهِ پا رسیده ای

بیدل ہی کا شعر ہے:

گویند که بهشت است همه راحت جاوید　　　　جائیکه بداغی نه تپد دل چه مقام است

بیدل کی نظر میں جنت کی کوئی وقعت نہیں کہ وہاں تپش دل نہیں ہے:

مباش همچو گهر مرده ریگ این دریا　　　　نظر بلند کن و همت حباب طلب

بیدل نے تخیلی استدلال سے گوہر کی مٹی پلید کر دی ہے اور حباب کو آسمان پر چڑھا دیا ہے، وہ یوں کہ گوہر تو سمندر کی آغوش میں پلتا ہے، یعنی دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ جب کہ حباب بلند ہمت اور بلند نظر ہوتا ہے کہ سمندر سے الگ اپنی شخصیت تراشتا ہے، اس لئے حباب گوھر سے افضل ہے۔ اسی نوع کے یہ اشعار بھی خوب ہیں:

برخط و زلف بتاں غرۂ عشقی بیدل　　　　حسن فهمیده ای اجزای پریشانی را

یعنی اے بیدل حسینوں کے خط اور ان کی زلف پر تم عاشق ہو، تم نے اجزائے پریشان کو حسن سمجھ لیا ہے۔

گر همه تنهائی اقبال است ننگ اختری است　　　　گریه بر حال یتیمی های گوهر می کنم

یعنی اگر تمام تر تنہائی کو تم خوش نصیبی کہتے ہو تو یہ ستاروں کے لیے باعث شرم ہے، میں گوہر کی یتیمی حالت پر (تنہا رہنے کی حالت پر) روتا ہوں۔

تخیل کا ایک رنگ تجسیم ہے یعنی شاعر اپنے خیال کو یا کسی غیر جاندار شے کو تشخص عطا کرتا ہے، اسے جاندار فرض کر لیتا ہے اور وہ تمام خصوصیات جو ایک ذی روح بلکہ انسان کے لئے مخصوص ہیں اس میں موجود سمجھتا ہے۔

بیدل کے اس شعر میں تجسیم کے ساتھ ساتھ حسن ادا اور نازک خیالی دیدنی ہے:

معجز خوبی نگر بیدل کہ ہنگام سخن
لعل خاموشش کشیداز غنچہ گوہر گلاب

(یعنی اے بیدل اعجازِ خوبی دیکھو کہ بات کرتے وقت اس کے (محبوب کے) خاموش ہونٹوں کے لعل نے گوہر کی کلی سے عرق گلاب کشید کرلیا ہے)

تخیل کے استعمال کی ایک صورت تمثیل یا ارسال المثل ہے جو بیدل کے کلام میں عام ہے۔

غزل میں تخیل کی کارفرمائی کا ایک کمال تمثال تراشی ہے۔ شاعر تخیل کے ذریعہ چند لفظوں میں کسی واقعہ یا جذبہ یا کیفیت کی ایسی خیال افروز تصویر پیش کرتا ہے کہ بہت سے معانی اور مفاہیم جو لفظوں میں تو موجود نہیں ہوتے لیکن شعر میں الفاظ کی ترتیب و ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ وہ معانی اور مفاہیم ذہن پر منعکس ہو جاتے ہیں۔ بیدل تمثال تراشی میں استاد فن ہیں۔

بیدل کا شعر ہے:

زین بادیہ رفتم بسر چشمۂ خورشید
چون سایہ بشویم زجبین گرد سفررا

یہ شعر تصوف اسلام کے اس تصور پر مبنی ہے کہ انسان جو ذات حق سے جدا ہو کر مقام وحدت، واحدیت، روح، مثال، جسم اور دوسری منازل طے کرنے کے بعد انسان ہونے کے مقام تک پہنچا تھا، مرنے کے بعد اپنی منزل مقصود یعنی ذات حق کو پالیتا ہے۔ گویا زندگی کا ایک بہت بڑا سفر طے کرنے کے بعد سر چشمہ خورشید (ذات حق) تک پہنچ جاتا ہے تاکہ اپنی پیشانی سے گرد سفر دھوئے۔ اس شعر میں اگرچہ موت کا ذکر نہیں لیکن "چوں سایہ بشویم زجبین گرد سفررا" کے الفاظ تصوف کے تصور موت کو منقش کر رہے ہیں۔

بیدل کا یہ شعر بھی اسی نوع کا ہے:

زاں اشک کہ چو شمع زچشم ترمن ریخت
مجلس ہمہ رنگین شدو گل در برمن ریخت

فارسی غزل شروع میں رودکی سے سنائی تک عام طور پر حسن محبوب کی تعریف و توصیف تک محدود تھی یا ان میں روایتی عشقیہ مضامین بیان ہوئے تھے۔ سنائی نے عشق کی کیفیات، جذبات، محبت اور واردات قلبی سے غزل کو آشنا کیا، ساتھ ہی عرفان وتصوف کے مضامین بھی غزل میں بیان کئے۔ یہ روایت بیدل تک کم وبیش قائم رہی۔ بیدل کی غزلوں میں فکر کا عنصر زیادہ ہے، بیدل سے پہلے غزلوں میں جذبہ کی برتری قائم تھی ___ اگرچہ حافظ کی غزلوں میں حکیمانہ نکتے ملتے ہیں اور حافظ شیرازی کے بعد سبک ھندی کے زیر اثر حکمت وموعظمت کا بیان غزل کی روایت میں داخل ہو گیا تھا اور صائب، نظیری اور دوسرے شعرا کے کلام میں یہ رنگ موجود ہے، لیکن فکر کا غالب عنصر بیدل کی غزلوں ہی میں ملتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی غزلوں میں جذبہ کی کمی ہے اور وہ صرف افکار ہی کا مجموعہ ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے پیش رو غزل گو شعرا کی بہ نسبت اس کی غزلوں میں فکر کا رچاؤ اور تحقیق وجستجو کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ تحقیق وجستجو یا نامعلوم کو معلوم کرنے کی خواہش ایک جبلی جذبہ ہے، ایک فطری خواہش ہے، یہی خواہش انسان کو غور وفکر پر مائل کرتی ہے، اسے شک سے دوچار کرتی ہے، دولت یقین بھی عطا کرتی ہے۔ لیکن اس جذبے یا خواہش کے پیچھے مختلف مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر یہ جستجو جہان فکر میں محسوسات تک محدود رہے تو سائنسی ایجادات وجود میں آتی ہیں اور اگر معقولات سے وابستہ ہو تو فلسفیانہ نظریے جنم لیتے ہیں اور اگر جذبہ وتخیل سے سروکار رکھے تو فن تخلیق پاتا ہے۔ سنگتراش پتھروں سے مجسمہ، مصور رنگوں

سے تصویر اور شاعر لفظوں سے شعر تخلیق کرتا ہے' خوبصورت تصویر ہو یا دلا ویز مجسمہ یا دلنشین شعر' حسن کی تلاش و جستجو کا ثمرہ ہے ___ سائنسدان کا مقصود حقیقت اشیا کا جاننا ہے' مفکر کا مقصود حق کی جستجو ہے اور فنکار کا مقصود حسن کی تلاش ہے۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو تینوں کا مقصود ایک ہی ہے کہ حقیقت' حق اور حسن در حقیقت ایک ہی ہیں جو حسن ہے وہی حق ہے' جو حق ہے وہی حقیقت ہے بقول کیٹس

Beauty is truth and truth is beauty. (Keats)

سائنسدان کا موضوع تحقیق' خارجی دنیا ہے' مفکر کا موضوع فکر حقائق ذات و کائنات ہیں' شاعر بالخصوص غزل گو شاعر کی فکر کا محور اس کی ذات یا اس کی اندرونی دنیا ہوتی ہے۔ وہ ذاتی تجربات و احساسات اور اپنی اندرونی دنیا سے سروکار رکھتا ہے۔ محبوب بھی ایک طور سے اس کی ذات ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ خارجی دنیا کو اپنی ذات ہی کے حوالے سے دیکھتا ہے اور اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس لئے جستجو اور غور و فکر کا عنصر ہر شاعر کے ہاں غیر محسوس انداز میں ہوتا ہے لیکن بیدل اور علامہ اقبال کے کلام میں یہ عنصر نمایاں بلکہ غالب ہے۔ یہ فکر کا عنصر غالب کے کلام میں بھی ہے' غالب کے ہاں عام مفکرانہ رویہ ہے' علامہ کے کلام میں ملی مسائل ان کے فکر کا محور ہیں' جب کہ بیدل کے فکر کا موضوع حقائق حیات و کائنات ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ اپنی ذات کی جستجو سے نا امید مت ہو یہی نور تو خورشید یا محبوب حقیقی تک رہنمائی کرتا ہے۔ میں نے خود کو ڈھونڈا مجھے محبوب مل گیا' ذرہ کی تلاش میں گویا سورج ہاتھ آ گیا ___ صاحب ہوش کے لئے کتاب و قلم کی ضرورت نہیں صرف غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اس چمن کا پتا پتا خالق کی صنعت کاری کا نمونہ ہے ___ احتیاج ہی نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ احتیاج ہی ہماری بات میں مٹھاس پیدا کرتی ہے کہ جب کسی سے مطلب ہوتا ہے تو ہم بڑی نرمی سے گفتگو کرتے ہیں۔

اس دنیا میں آگہی بھی باعث تشویش بنتی ہے اس لئے تھوڑی سی غفلت بھی جینے کے لئے ضروری ہے۔ زمانے کے ساتھ سختی سے نہیں پیش آنا چاہیئے بھلا کوئی پتھر کو بھی دانتوں سے توڑتا ہے:

مباش از جستجوی خویش نومید — همین نوراست رهبر تا بخورشید

در فکر خودم معنی اوچهره گشاشد — خورشید برون ریختم از ذره شکافی

هوش اگر باشد کتاب ونسخه ای درکارنیست — چشم واکردن زمین تا آسمان فهمیدن است

همچو شبنم از تامل دیده ای گروا کنی — برگ برگ این چمن جزلوح استعدادنیست

نغمه قانون این محفل صلایی جود کیست؟ — عالمی را از عدم آورد بیرون احتیاج

عرض مطلب زمی الفاظ انشامی کند — حرف ناموزون مارا کردموزون احتیاج

به قدر آگهی آماده است اسباب تشویشت — طبیعت باید اینجا اندکی غافل شود پیدا

باسختی ایام درشتی مفروشی — ای بی خردان سنگ به دندان که شکست است؟

شک، جستجو اور تحقیق، فکروشعور ہی کا ایک رنگ اور اسی کا ایک انداز ہے، یہ رنگ بیدل کی غزلوں میں عام ہے:

زعرض شبهه تهی نیست نسخهٔ تحقیق — تو آنچه کرده ای ازخویش انتخاب شک است

سواد نسخه تحقیق بیدل دقتی دارد — دوعالم جلوه باید خواندن وبی رنگ فهمیدن

بیدل چه ازل کو ابد از وهم برون آ — در کشور تحقیق نه صبح است نه شامی

یعنی نسخۂ تحقیق شبہ سے خالی نہیں (یعنی پہلے شبہ پیدا ہوتا ہے پھر حقیقت واضح ہوتی ہے) تم نے جو اپنے لیے منتخب کیا ہے وہ شک ہے۔ اے بیدل نسخۂ تحقیق کی سیاہی فکر کی گہرائی رکھتی ہے۔ دوعالم کو جلوہ کہنا اور بے رنگ سمجھنا۔

جستجو اور تحقیق کا ایک پہلو عالم شناسی بھی ہے اور اس کے لئے فکر ونظر کی گہرائی

بھی چاہئے اور بلندی بھی اور بقول بیدل جب تک بلبل کی طبیعت کے آشنا نہیں بنو گے گل کے رنگ کی خاصیت بھی نہیں جان سکو گے:

تا محرم طبیعت بلبل نمی شوی

رنگ آشنائی خاصیت گل نمی شوی

بیدل کی نظر میں کفر و دین بھی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں یعنی مذہب بھی تقلیدی نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے بھی تحقیق سے دینی صداقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' دین اسلام خاص طور پر ایک سچا مذہب اور دین فطرت ہے جو خود غور و فکر کی دعورت دیتا ہے۔ اگر غور و فکر صدق دلی سے ہو تو صداقت دین حق یقیناً ہاتھ آئے گی' یہ ایسا ہی ہے بقول بیدل کہ سیلاب ہر طرف رخ کرتا ہے لیکن بالآخر پہنچتا سمندر ہی میں ہے۔ محقق دین بھی تمام ادیان کو جب پرکھے گا تو دین حق کی صداقت بالآخر اس پر روشن ہو جائے گی ___ اے بیدل کوئی شخص عرشِ حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک وہ حضرت رسول پاک ﷺ کے پاؤں کی مٹی نہ بن جائے۔

کفر و دین مانع تحقیق نگاہان نشود سیل ہر سو گذرد راہ بدر یا دارد

بیدل کس بہ عرش حقیقت نمی رسد تا خاک راہ احمد مرسلؐ نمی شود

عجز ادراک بھی درحقیقت ادراک ہی کا ایک پہلو ہے۔ صوفیہ کا قول ہے "العجز عن درک لا دراک ادراک" یہ پہلو بھی ان کی غزلوں میں ملتا ہے:

عجز ادراک اگر فہمیدی معنی این است کہ فہمیدن نیست

یعنی عجز ادراک کو اگر تم سمجھ گئے تو یہ حقیقت پا لی کہ حقیقت کو نہیں پایا جا سکتا۔

عکس افتادہ در آئینہ ہوش گل توان گفت ولی چیدن نیست

یعنی عقل کے آئینے کو یہ عکس ملا ہے کہ پھول کہہ تو سکتے ہیں لیکن اسے توڑا نہیں

جا سکتا۔

بیدل اپنی غزلوں میں سوالیہ انداز میں حقائق کا اظہار فرماتے ہیں' یہ وہی انداز ہے جسے اردو میں غالب نے اپنی اس غزل۔

''ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے'' میں اپنایا تھا لیکن بیدل کا انداز بہت بلند بھی ہے اور فکر انگیز بھی:

بحر بی تاب کہ آن گوہر نایاب کجاست؟ چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہان تاب کجاست؟

دیر ازین غصہ در آتش کہ چہ رنگ است ضم؟ کعبہ زین درد سیاہ پوش کہ محراب کجاست؟

یعنی سمندر بے چین ہے کہ وہ گوہر نایاب کہاں ہے؟ آسمان پریشان ہے سرگردان ہے کہ جہاں تاب سورج کہا ہے؟ آتشکدہ اس غم کی آگ میں جل رہا ہے کہ بت کس رنگ کا ہے؟ اور کعبہ اس غم میں ماتمی لباس (سیاہ لباس) بنے ہوئے ہے کہ محراب (سجدہ کرنے کے لیے) کہاں ہے؟

سر شکم نسخۂ دیوانہ کیست؟ جگر آئینہ دار شانہ کیست؟

بلبل بنالہ حرف چمن را مفسر است یارب زبان نکہت گل ترجمان کیست؟

یعنی میرا آنسو کس دیوانے کا نسخہ ہے اور جگر کس کے شانہ کا آئینہ دار ہے؟ بلبل اپنے نالوں سے چمن کی باتیں بیان کر رہا ہے لیکن پھول کی خوشبو کی زبان کس کی ترجمانی کر رہی ہے؟

اس غزل میں بھی یہ سوال کرنے کا انداز حقائق کائنات کی تحقیق ہی کی غمازی کرتا ہے:

صبح از چہ خرابات جنون کرد بہارش کہ آفاق گرفتہ است بہ خمیازہ خمارش

یہی انداز اس خوبصورت غزل میں بھی ہے:

چنین کشتۂ حیرت کیستم من   کہ چو آتش از سوختن زیستم من

نہ شادم، نہ محزون، نہ گردون نہ خاکم   نہ لفظم، نہ مضمون، نہ معنی استم من

اگر فانیم چیست این شورِ ہستی؟   وگر باقیم ازچہ فانیستم من؟

بہ ناز ای تخیل، بہ بال ای توہم   کہ ہستی گمان دارم و نیستم من

یعنی میں یوں کس کی حیرت سے قتل ہوا کہ آگ کی طرح جلنے ہی میں میری زندگی ہے (کہ حرارت ہی سے جسم زندہ ہے اگر یہ ختم ہو جائے تو موت آجاتی ہے)___ نہ میں خوش ہوں، نہ غمگین ہوں، نہ میں آسمان ہوں، نہ میں زمین ہوں۔ نہ میں لفظ ہوں، نہ معنی ہوں___ اگر میں فانی ہوں تو یہ زندگی کا شور کیا ہے؟ اگر میں لافانی ہوں تو فانی کیوں ہو؟ اے تخیل ناز کر، اے توہم فخر کر کہ میں یہ گمان رکھتا ہوں کہ میں زندہ ہوں اور ہوں مردہ۔

تحقیق و آگہی فلسفہ بیدل کی جان ہے۔ میرزا بیدل نے اپنے کلام میں تقلید و روایت پرستی کی سخت مذمت کی اور تحقیق وحصول آگہی کی بے حد تلقین کی ہے۔ ادراک، حقیقت کی طلب ان کے ہاں تڑپ کی حد تک ہے۔ اس راہ میں ہر شے آئینہ دار حیرت ہے۔ یہ حیرت بوجہ جہل نہیں بلکہ بسبب آگہی ہے جسے متصوفین حیرت محمود کہتے ہیں اور بیدل نے اسے حیرت ادراک کہا ہے:

دل انجمن محرم بیگانہ نباشد

جز حیرت ادراک درین خانہ نباشد

اس کے علاوہ ان کی نظر میں حواس ظاہری سے حقائق کا ادراک ممکن نہیں اس لئے حواس روحانی یا بیخودی یا عشق یا بصیرت درکار ہے اس کے علاوہ دوسروں کی پیروی کرو گے تو تم حق کو نہیں پا سکتے، تقلید کو چھوڑو گے تو حقیقت کو پاؤ گے:

ای کہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش
عمرھا باید کہ دریابی زبان خویش را
مدتی برہم زدن دارد قماش خوب و زشت
تاشناسی جنس موہوم دکان خویش را

☆☆☆

تبعیت خلق از حقت غافل کرد
ترک تقلید گیر تحقیق این است

میرزا بیدل کی غزل میں زندگی کی حقیقتوں اور عوامی مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے ان کا کلام عظمت انسانی اور خودشناسی کے مضامین سے پر ہے۔ وہ کاہلی، بیکاری، تقلید اور روایت پرستی کی مذمت، تحقیق و حصول آگاہی اور سعی و کوشش کی تلقین نہایت شدومد سے کرتے ہیں یوں میرزا بیدل فارسی شعرا میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔

میرزا بیدل کی غزلیں عام طور پر وحدت تاثر کی عکاس ہوتی ہیں اگرچہ خیالات مختلف ہوتے ہیں یعنی غزل کا ہر شعر ایک علیحدہ خیال کا حامل ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر پوری غزل میں ایک معنوی ربط ہوتا ہے۔ بعض غزلیں نظم کا سا روپ رکھتی ہیں۔ اسی طرح ان کی غزلیں اور اشعار ایسے بھی ہیں کہ جن میں صرف تصوف کے مضامین ہی بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کی غزلیں اور اشعار ایسے بھی ہیں کہ جن میں صرف ایہام گوئی اور لفظی بازیگری ہے جو ان کے عہد کی شعری خصوصیت تھی لیکن ان کا بیشتر کلام حقائق حیات ہی کا ترجمان ہے۔ میرزا بیدل کے کلام میں جسے عام طور پر دقت گوئی یا مشکل پسندی سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، درحقیقت وہ ابلاغ کامل ہی کی ایک صورت ہے۔ جس قطعیت اور

جامعیت کے ساتھ وہ اپنے خیال کو پیش کرتے ہیں اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہ پرشکوہ اور دقیق اسلوب اختیار کریں۔ان کا ایک شعر ہے:

نشۂ همت بسامان نیست
ورنہ کو مشکلی کہ آسان نیست

عام طور پر تو یہی کہتے ہیں کہ ہمت کرنے سے ہر مشک آسان ہو جاتی ہے:

ہمیت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

لیکن میرزا بیدل یوں کہتے ہیں کہ ہمت کا نشہ اگر پوری طرح موجود ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے یعنی صرف ہمت یا عزم ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ جوش عمل بھی ہو تب ہی ہر مشکل آسان ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف ارادے سے مشکلیں آسان نہیں ہوتیں، ارادہ کے ساتھ جوش عمل بھی ہو تب بات بنتی ہے۔ارادے کے ساتھ جوش عمل کے عنصر کو میرزا بیدل نے ''نشۂ همت بسامان'' کی ترکیب میں بڑی ایمائیت سے پیش کیا ہے۔یوں یہ شعر ابلاغ کامل کا حامل ہے دقاقت کا نہیں۔ان کا ایک شعر ہے:

محو شوقم تہمت آلودِ فسردن نیستم
در گریبانِ تامل، قطرها دارد گہر

اس شعر میں فکر میں مستغرق بیٹھنے اور بیکار بیٹھنے کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں کہ میں تہمت افسردگی نہیں رکھتا میں تو محو شوق ہوں اور تمثیلاً فرماتے ہیں کہ پانی کے قطرے بھی تو جب سیپی کے اندر (گریباں تامل میں یعنی فکر میں محو ہوتے ہیں) تو موتی بن جاتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ جب میں محو شوق ہو کر غور و فکر میں خاموش بیٹھتا ہوں تو بظاہر بیکار نظر آتا ہوں یا تہمت بیکاری و افسردگی رکھتا ہوں لیکن درحقیقت غور و فکر کے عمل میں مصروف ہوتا

ہوں اور یوں حقائق کے گوہر حاصل کر رہا ہوتا ہوں ___ اس شعر میں افسردگی کا لفظ مایوسی' بیکاری اور کاہلی کے تمام معانی پر محیط ہے اور شوق کا لفظ آرزو' تمنا' غور و فکر اور جوش کی دلالتیں لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح اسی شعر میں:

عذر ضیعفی دمی کائینہ گیرد بدست
آبلہ در پای سعی ناز حنا می شود

سعی و کوشش اور عزم و عمل کی عظمت کو بیدل نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ میرزا بیدل کہتے ہیں کہ وہ شخص جو تھک کر آبلہ پائی کی وجہ سے کچھ دیر ستا تا ہے اس کے بیکار بیٹھنے کا عذر بے حد واضح اور معقول ہوتا ہے بلکہ وجہ صد افتخار و ہتا ہے کہ اس کے پاؤں کے آبلے "ناز حنا" نظر آتے ہیں۔

حمد و نعت کے مضامین بیان کرنے میں تمام بڑے شعرا نے داد سخن دی ہے لیکن میرزا بیدل کا انداز اس میدان میں بھی منفرد ہے۔ ان کے حمدیہ اشعار میں عشق کی حرارت' جذبہ کی صداقت' فکر کی عظمت کے ساتھ ساتھ الفاظ کا انتخاب' خیال آرائی اور نکتہ آفرینی بھی اپنے کمال فن کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ ان کی ایک غزل (جو تمام حمدیہ اشعار پر مشتمل ہے) کا ایک شعر ہے:

زہے چمن ساز صبح فطرت' تبسم لعل مہر جویت
زبوی گل تا نوای بلبل' فدای تمہید گفتگویت

یعنی تیرا تبسم لعل مہر جو کیا خوب چمن ساز صبح فطرت ہے' اے محبوب حقیقی! تیرے محبت کے طلبگار ہونٹوں کی مسکراہٹ کیا خوب صبح فطرت بن کر کائنات کی چمن سازی (آرائش) کر رہی ہے کہ نوای بلبل ہو یا بوی گل' ہر شے تیری تمہید گفتگو پر قربان ہو رہی ہے یعنی ہر شے تیری خلاقیت و ربوبیت کی حمد و ثناء میں مصروف ہے۔

اس شعر میں تمام تراکیب بڑی گہری اور وسیع معنویت کی حامل ہیں۔ صبح فطرت سے مراد صبح ازل، تخلیق کی صبح جب لفظ کن کہہ کر کائنات کو تخلیق کیا گیا، چمن سازی سے تخلیق کا عمل ہی مراد نہیں بلکہ ''احسن تقویم'' اور ''احسن الخالقین'' کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو تخلیق ہے وہ حسین ہے، خوبصورت ہے، کامل ہے۔ ''تبسم لعل مہر جو'' کی ترکیب صوفیہ کے اس نظریہ کی طرف اشارہ ہے کہ علت تخلیق کائنات عشق ومحبت یا حرکت حبی ہے جو اس حدیث ''کنتُ کنزاً مخفیا فاجبت ان اعرف فخلقت الخلق'' سے مستنبط کیا جاتا ہے۔ ''گفتگو'' سے خداوند تعالیٰ کا لفظ ''کن'' کہنا مراد ہے اور تمہید گفتگو سے مراد ہے کہ ابھی بات کرنے کی تمہید باندھی ہے، اصل گفتگو تو ابھی شروع ہونی ہے یعنی کائنات ابھی تخلیق کے ابتدائی مدارج میں ہے۔ ابھی کائنات کو ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں۔ اس کے علاوہ الفاظ کی مناسبت نے بھی اس شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ صبح جو زندگی اور تخلیق کی علامت ہے اس کی مناسبت ''تبسم'' کے ساتھ ہے، لفظ لعل کی مناسبت گفتگو سے ہے کہ لعل لب کا استعارہ ہے اور چمن کی نسبت فطرت اور گل وبلبل سے ہے، یہ مناسبت لفظی یا مُراعات النظیر کا استعمال تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ ان مناسبات کے بے ساختہ استعمال نے اس شعر کو اعجاز کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ یہی بیدل کا انداز شعر گوئی اور اسلوب سخن سنجی ہے۔ اسی رنگ میں اور اسی اسلوب کی حامل بیدل کی یہ غزل بھی ہے، جس کا یہ شعر ہے:

رنگ طاقت سوخت اما وحشت آغازم ہنوز
چشم بر خاکستر بال است پروازم ہنوز

اس شعر میں بیدل کہتے ہیں کہ عشق میں جل کر راکھ ہو گیا ہوں لیکن جنون عشق اسی طرح تازہ ہے یہاں تک کہ میرے بازو اور پر جل کر خاکستر ہو گئے ہیں وہ فضا میں اڑ رہے ہیں یعنی میری خاک ہوا میں اڑ کر دیوانہ وار رقص پیش کر رہی ہے جو میرے عشق اور

شوق و جنون کی نشانی ہے۔ یعنی مر کر بھی میرا عشق اور شوقِ جنون قائم رہا ہے۔ بلکہ وحشت اور جوش جنون کا آغاز ہوا ہے۔ اسی غزل کا دوسرا شعر ہے:

پیکرم چون اشک در ضبط نفس گردیدہ آب
می شمارد عشق چون آئینہ غمازم ہنوز

اس شعر کا مفہوم بیان کرنے پہلے دو تین باتیں پیش کرنا ضروری ہیں' تصوف میں کائنات:

(۱) ایک آئینہ ہے جو تجلیات حق کی عکاسی کر رہا ہے۔

(۲) آئینہ اشک کا بھی استعارہ ہے۔

(۳) آئینہ شکلوں کا دکھاتا ہے یعنی چہرے کی خوبیوں اور خامیوں کو ظاہر کرتا ہے گویا راز فاش کرتا ہے' اشک بھی اگر عاشق کی آنکھوں میں ہو تو اس کے عشق کا راز فاش کر دیتا ہے۔

(۴) صوفیہ میں حبس دم کا رواج ہے اور ایک سانس میں ہزاروں بار کلمہ کا ورد کیا جاتا ہے۔ تصوف میں قربت الٰہی یا عشق حقیقی راز و نیاز ہی کی ایک صورت ہے اور عشق حق میں صوفی فراق کی کیفیت سے دوچار بھی ہوتا ہے اور اس غم فراق کو ضبط کرنے میں آنسو بھی آجاتے ہیں گویا عشق ایک اشک میں ڈھل جاتا ہے۔ اس شعر میں بیدل کہتے ہیں کہ میں ضبط نفس یا ضبط فراق میں اشکوں میں ڈھل گیا ہوں اور عشق یہ سمجھتا ہے کہ میں آئینے کی طرح راز عشق کو افشا کر رہا ہوں' اس شعر میں:

زین چمن عمریست گلچین تماشای توام
دور از آغوش خیالت یک گل اندازم ہنوز

بیدل کہتے ہیں اگرچہ میں ایک مدت سے اس چمن کائنات میں تیرے جلووں کا

گلچین یعنی تماشائی ہوں ابھی تک تیرے آغوش تصور سے بہت دور پھول پھینک رہا ہوں یعنی اگرچہ انسان ایک مدت سے کائنات میں تجلیات حق دیکھ رہا ہے اور اس ذات کا عرفان حاصل کرنے اور اسے پانے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن اس کے باوجود اس (حق) کی ذات کے تصور اور خیال سے بہت دور ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کو دور سے پھول پھینک کر مارتا ہے ہم اپنے محبوب حقیقی کو دور سے پھول پھینک رہے ہیں، اظہار عشق کر رہے ہیں کیونکہ اس کا خیال بھی کرنا محال ہے یعنی اس کے بارے میں سوچتے تو ہیں لیکن وہ ہمارے خیالات اور تصورات سے بلند اور برتر ہے۔ قرآن کی آیت "سبحان اللہ عمایصون" کے معنی کو اور صوفیاء کے قول "العجز عن درک الادراک ادراک" کے مفہوم کو اس شعر میں شاعرانہ اور متصوفانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس قسم کا مضمون بیدل کے ان شعروں میں بھی ہے:

حسن یکتایی و آغوش دوئی و ہم است و وہم
تا تو از آئینہ می یابی اثر دیدار نیست

حسن یکتا کو دوئی کی آغوش میں یعنی حسن حق کو کائنات کے مناظر میں دیکھنا ایک وہم وخیال ہے۔ جب تک تو آئینہ کی طرف نظر رکھے گا اس وقت تک دیدار حق سے محروم رہے گا۔ یہاں آئینے سے مراد کائنات ہے یعنی کائنات سے منہ موڑ کر خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف لوٹنا چاہیئے، گویا قرآنی آیات آفلین (سورہ ۶، آیات ۷۶ تا ۷۸) کی طرف بھی اشارہ ہے جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند، سورج اور ستاروں کو رد کر کے خدائے وحدہ لاشریک کا اقرار کیا تھا۔ تقریباً اسی مضمون کو اس شعر میں بھی بیان کیا ہے:

حسن یکتا چہ جنون داشت کہ از ننگ دوئی
خواست بر سنگ زند آئینہ بر ما زدہ است

نجانے حسن یکتا کو کیا جنون ہوا کہ دوئی کی غیرت میں آ کر چاہتا تو یہ تھا کہ آئینے کو توڑ دے لیکن پتھر میرے سر پر دے مارا۔ یہاں یہ لطیف نکتہ ہے کہ آئینہ یعنی ماسوائے حق جو کائنات ہے حسن یکتا کو غیرت یکتائی میں اس آئینہ کائنات کو توڑنا چاہئے تھا لیکن اس نے وہ پتھر جس سے ماسوا کو توڑنا تھا میرے سر پر دے مارا اور یہاں سنگ سے مراد آئینہ ہے کہ آئینہ بھی تو جلا شدہ سنگ ہے جو صورت پذیری رکھتا ہے اور شعور بھی آئینہ ہے جو تصور پذیری کی صلاحیت رکھتا ہے اسی لئے آئینہ شعور کا استعارہ بھی ہے' یہاں پتھر میرے سر پر دے مارا کا مفہوم یہ ہوا کہ حسن یکتا نے میرے ذہن کو آئینہ بنا دیا یعنی مجھے عقل عطا کر دی جو کائنات میں کسی کو بھی حاصل نہیں' میں ہی (انسان ہی) عین اور غیر میں تمیز کر سکتا ہوں' میں ہی یکتائیت اور دوئی میں فرق کر سکتا ہوں گویا میں ہی امانت الٰہی کا حقدار بنا "اناعرضنا الامانت" کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہے۔

بات تو صرف یہ کہنا تھی کہ انسان ہی تھوڑا بہت شعور یکتائی رکھتا ہے یا انسان ہی امانت الٰہی کا حقدار ہے لیکن اس مفہوم کو عشق اور تصوف کی روایات کے ساتھ اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ شعر کو طلسم خانۂ فکر و تخیل ہی نہیں بنا دیا بلکہ زبان و بیان کا جادو بھی جگا دیا ہے' بیدل کا یہ دل پسند مضمون ہے۔ اس شاعر خدا مست نے خدا کی وحدانیت و یکتائیت کے مفہوم اور اس سے متعلق مطالب کو بڑے ہی خوبصورت اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی یہی مطالب ہیں:

عشاق گر فسانۂ تحقیق سر کنند
آئینہ بشکنند و سخن مختصر کنند

☆☆☆
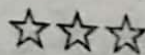
داغم از سودای خام و غفلت و وہم رسا

او سپہر و من کف خاک، او کجا و من کجا

☆☆☆

عجز را گر در جناب بی نیازی ہا رہی است

اینقدر ھا بس کہ تا کویت رسد فریاد ما

☆☆☆

آرزو خون گشتہ نیرنگ وضع ناز کیست ؟

غمزہ دارد دور باش و جلوہ می گوید بیا

☆☆☆

جہان گل کردن یکتائی اوست

ندارد شخص تنہا جز خیالات

☆☆☆

بحر در آغوش و موج ما ہمان محو کنار

کار ہا با عشق بی پرواست معذوریم ما

☆☆☆

با کمال اتحاد از وصل مہجوریم ما

ہمچو ساغر می بلب داریم و مخموریم ما

☆☆☆

عالم نسیان تماشا خانہ یکتائی است

عکس بود آن جلوہ تا آئینہ ام در یاد بود

☆☆☆

بچندین اختلاف صورت و معنی من بیدل

جز او دیگر چہ خواہم وانموذ آئینہ اویم

☆☆☆

زیر بحث غزل کے دو اور شعر:

مردہ ام اما ہمان رقص غبارم تازہ است

خاک راہ کیستم یارب کہ می نازم ہنوز

یعنی مرنے کے بعد میری جو خاک اڑ رہی ہے در حقیقت، میں کسی کے عشق کے جوش میں ہی رقص کر رہا ہوں نجانے کس کے راستے کی مٹی بنا ہوا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی مست ناز ہوں:

بی تو پیش از اشک شبنم زین گلستان رفتہ ام

می دھد گل از شکست رنگ آوازم ہنوز

تیرے بغیر اس گلشن جہان میں کیا دل لگتا، میں اشک شبنم سے پہلے یا اتنی مدت میں کہ قطرہ شبنم سورج کی کرن کی گرمی سے ہوا میں تحلیل ہو جائے یا اڑ جائے، اس مدت سے بھی پہلے اس چمن دنیا کو چھوڑ گیا ہوں۔ دنیا کی رونقیں مجھے بلا رہی ہیں کہ اس کی رونقیں میرے ہی دم قدم سے قائم ہیں۔ اسے یوں کہا ہے کہ پھول شکست رنگ سے مجھے آواز دے رہا ہے۔ پھولوں میں رنگ بھی تو انسانوں ہی کے دم قدم سے ہے۔

میرزا بیدل نے غزل گوئی میں نہ صرف معانی و مطالب اور انداز بیان اور افکار بدیع کے حوالے ہی سے اپنی برتری قائم کی ہے بلکہ فن غزل گوئی کے دیگر پہلوؤں سے بھی ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ ان کی غزل میں نہ صرف یہ کہ ہر لفظ منتخب، خوبصورت اور فصیح ہوتا ہے بلکہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ بھی موجود ہوتا ہے۔ دل کش تراکیب غزل کے

حسن میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ ان کی غزل ایک خاص آہنگ یا غنائیت لئے ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شعر موسیقیت اور غنائیت میں ڈھل کر نکلا ہے۔ ایک عام آدمی بھی یہ شعر سن کر مسحور ہو جاتا ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ ای در دل کشا بہ چمن درآ

یہ شعر سن کر ہر صاحب ذوق پکار اٹھتا ہے کہ یہ مسحور کن آہنگ اور موسیقیت دوسرے تمام شعرا فارسی سے مختلف اور منفرد ہے۔

انہوں نے طویل اور مشکل بحروں میں یعنی ان بحروں میں جن میں آج تک کسی نے غزل نہیں کہی تھی یا اگر کسی استاد نے کہی تھی تو ایک آدھ غزل ہی کہی تھی، بہت سی غزلیں کہی ہیں اور ساتھ ہی خوبصورت بھی:

ہمہ عمر با تو قدم زویم نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار مابہ کنار ما

زہے چمن ساز صبح فطرت تبسم لعل مہر جویت
زبوی گل تانوای بلبل فدای تمہید گفتگویت

اور سنگلاخ زمینوں میں مشکل قافیوں اور ردیفوں کے باوجود بڑی ہی پر معنی اور فکر انگیز شعروں پر مبنی غزلیں کہی ہیں۔

ایک غزل میں ''تیغ است'' کی ردیف ہے جس میں کوئی کام کا شعر کہنا بہت مشکل ہے لیکن میرزا بیدل کے سارے ہی شعر خوبصورت ہیں۔ دو شعر درج کئے جاتے ہیں:

غنچہ ای نیست کہ زخمی ز تبسم نخورد
باخبر باش کہ انداز شگفتن تیغ است

یعنی کوئی کلی ایسی نہیں جو مسکراہٹ کا زخم نہ سہتی ہو، باخبر رہیے کہ کھلنے کا انداز تلوار ہے۔

☆☆☆

مصرع تازہ کہ از بحر خیالم موجی است
دوست را آب حیات است و بدشمن تیغ است

یعنی ایک تازہ مصرع جو میرے خیال کے سمندر کی ایک موج ہے دوستوں کے لیے آب حیات ہے اور دشمن کے لیے تلوار ہے۔

انتخاب الفاظ، جدت ترکیب، حسن استعارہ وتشبیہ، نازک خیالی، انداز بیان کا تیکھاپن، تمثیل نگاری اور تمثال تراشی میرزا بیدل کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ میرزا بیدل تخیل بلند، فکر عمیق، تناسب الفاظ اور تقابل معانی سے اشعار کا جو طلسم خانہ تخلیق کرتے ہیں وہ بظاہر طاؤس سخن کی تمثیل اور بہ معنی عنقائے فکر کی تمثال ہوتا ہے۔ صاحب خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی نے مندرجہ ذیل شعر میں کیا خوبصورت اور صحیح تبصرہ کیا ہے:

رساند پایۂ معنی بہ آسمان نہم
بلند طبع شناسد کلام بیدل را

یعنی بیدل نے معانی کا مقام آسمان نہم تک پہنچا دیا، ایک بلند طبع شخص ہی بیدل کے کلام کو سمجھ سکتا ہے، اس کی قدر جان سکتا ہے۔

میرزا بیدل کو اپنے فکر وفن اور اپنی شخصیت کی عظمت اور انفرادیت کا احساس تھا اس لئے اکثر بڑے ہی پر معنی انداز میں اس کا ذکر بھی کیا ہے:

بہار آرزو در دل، گل امید در دامن
بہر رنگی کہ می آیم چمن پرداز می آیم

بیدل اگر نہ طبع تو مشاطگی کند
آئینہ دار شاہد معنی بیان کیست؟

ہیچ کس نیست زبان دان خیالم بیدل
نغمہ پردۂ دل از ہمہ آہنگ جداست

بہ فکر تازہ گویان گو خیالم پرتو اندازد
پر طاؤس گردد جدول اوراق دیوان ہا

بیدل از مشت غبار حسرت آلودم مپرس
یک بیابان خار خارم یک نیستان نالہ ام

بکلام بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسی نمی طلبد ز تو صلۂ دیگر مگر آفرین

گر بہ تحسین نکشاید لب یاران بر جاست
در نیستان قلم معنی ما شکر داشت

با ہمہ سامان قدرت شخص تسلیم اعتبار
با کمال کبریائی پیکر بیدل لقب

تنگ ظرف احتیاطم ورنہ مانند حباب
بحر می بالد ز آغوش گداز ہستیم

چو گوہر دقت طبعم برون افگندہ زین دریا
بخود گنجیدہ ام چندانکہ در عالم نمی گنجم

غیر من زین قلزم ہستی حبابی گل نکرد
عالمی صاحب دل است اما کسی بیدل نشد

بیدل فکر و فن کی اس بلندی سے بات کرتے ہیں جہاں فکر سہل پسند رسائی حاصل نہیں کر پاتا کہ بقول آزاد بلگرامی:

بلند طبع شناسد کلام بیدل را

ذوق و فکر انساں بالغ و بلند ہوں گے تو بیدل کا کلام عام ہوگا' پڑھا جائے گا' سمجھا جائے گا اور بیدل کا مقام پہچانا جائیگا اور پھر شاید اس وقت فکر کے رچاؤ کے رسیا لوگ غالب ایسے شعرا کے مقابلے میں بھی کلام بیدل کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اسے شاید سو سال لگیں' البتہ اس حقیقت سے تو اب بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

''عالمی صاحب دل است اما کسی بیدل نشد''

حواشی

۱۔ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا_ اسد اللہ خان قیامت ہے۔

۲۔ مجنون گورکھپوری: نکات مجنون۔

۳۔ عابد علی عابد: اسلوب۔

۴۔ عباد اللہ اختر: بیدل۔

۵۔ ڈاکٹر عبدالغنی: روح بیدل۔

۶۔ خواجہ عبدالرشید: معارف النفس۔

کلامِ بیدل
میں
عظمت انسانی کے افکار

میرزا بیدل عظمت انسان کے علمبردار اور انسان دوستی کے زبردست داعی تھے۔ وہ انسان کو ثمر نہال حقیقت اور چمن بہار خدائی کہتے ہیں۔ عظمت انسان کے نقش کو انہوں نے بہت ہی خوبصورت اور فکر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ فطرت ایک عمر زندگی کی جنگ لڑتی ہے تب کہیں نقش ادب بنتا ہے اور انسان پیدا ہوتا ہے:

فطرت عمری کند تگ و تاز نفس
تا نقش ادب بندد و انسان گردد

اور ایک شعر میں بیدل فرماتے ہیں کہ انسان ہونا کوئی معمولی بات نہیں، دو جہاں مٹی بنے تب کہیں نقش انسان بنا:

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

میرزا بیدل عظمت انسان کے باب میں یہاں تک کہہ گئے کہ عارف الٰہی نے جب بنظر تحقیق دیکھا تو معلوم ہوا کہ طالب اللہ ہے اور مطلوب انسان ہے:

عاف کاینجا نقاب تحقیق کشود
طالب اللہ دید و مطلوب انسان

ان کا یہ قول کس قدر فکر انگیز، حقیقت آمیز اور انسانیت آموز ہے کہ انسان بننا خود ہی کو پانا ہے "انسان گشتن بخود رسیدن بودہ است" اور انسانیت اپنی ذات کے شعور ہی کا نام ہے:

آدمیت ز خویش باخبری است
ما بقی ہر چہ ہست گاؤ خری است

خودی اور بے خودی کے مضامین بیدل کے کلام میں عام ہیں۔ بیدل خودی یعنی خودشناسی کے زبردست علمبردار تھے۔ ان کے کلام میں خودشناسی سے متعلق ہزاروں اشعار ہیں۔ بیدل کے کلام میں خودی اور بے خودی کے تصورات بڑے وسیع، ہمہ گیر اور فلسفیانہ ہیں، شاید ہی کوئی فارسی شاعر ہوگا سوائے علامہ اقبال کے جس نے اس موضوع پر اتنا زور دیا ہو۔ بیدل کی نظر میں خودی وہاں ہے جہاں ذات حق شہود میں ہے اور بے خودی وہاں ہے جہاں ذات حق غیب میں ہے:

نظر بر خویش او کردہ است اگر بینند پیدائش
بجیب خود فرو رفتہ است اگر یابند مستورش

☆☆☆

تو خود را گر بہ بینی نیست عالم غیر دیدارش
خودی آئینہ ای دارد کہ محرومی است اظہارش

بیدل کی نظر میں حقیقی ہوش تو بے خودی میں ہے۔ آغوش بے خودی ہی میں تمام حواس مجتمع ہو کر جاگ اٹھتے ہیں:

جمعیت حواس در آغوش بے خودی است
از ہوش بہرہ نیست کسی را کہ مست نیست

جہاں کہیں تجلیات حق ہیں وہاں ''پیغام خودی'' ہے:

بہر جا تجلی پیام خودی

همان در خفای دوام خودی

یکتای حقیقی شہادت این است

حیران خودی آئینہ دارت این است

ہم تو تعبیر و ہم تو خواب خودی

موج لب تشنہ سراب خودی

☆☆☆

عالم تمام عرض پیام خود است و بس

ای شوق نالہ کن کہ از خود ستودہ ای

برگ گلت ہزار چمن عرض و بوست

آئینہ خودی و جہانی نمودہ ای

بیدل کہتے ہیں اپنی ذات کی تلاش میں ناامید مت ہو، یہی نور ہے جو سورج تک رہبر ہے:

مباش از جستجوئے خویش نو مید

ہمین نور است رہبر تا بہ خورشید

اسرار کسے کہتے ہیں، رمز کیا چیز ہے، بس اپنے آپ کو پالو سب کچھ وہیں ہے:

کدام رمز و چہ اسرار، خویش را دریاب

کہ ہر چہ ہست نہان غیر آشکار نو نیست

بلکہ دونوں جہاں کو فراموش کر دو اور اپنی ذات میں مشغول ہو جاؤ اور سینکڑوں جہانوں کا کام

سنوارو:

فراموش نیاز این و آن کن
بخود پرداز و کار صد جہان کن

بیدل کہتے ہیں کہ میرے آئینے میں اس قدر نور ہے کہ میں ہر ذرہ کو دو سورج عطا کرسکتا ہوں:

آنقدر ہست در آئینہ من مایۂ نور
کہ بہ ہر ذرہ دو خورشید نمایم تقسیم

انسان خودشناسی ہی سے خداشناسی حاصل کرسکتا ہے۔ اس عام مضمون کو بیدل نے بڑے ہی اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ بیدل کہتے ہیں میں اپنی ذات پر غور وفکر کررہا تھا کہ اس کی حقیقت چہرہ کشا ہوگئی گویا ذرہ شگافی میں سورج ہاتھ آگیا۔ یعنی ذرہ کا جوجگر چیرا تو وہاں سورج مل گیا۔ ''خورشید برون ریختم ''میں بڑی ڈرامائی تصویر کشی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ عرفان نفس ہو کہ عرفان آفاق، دونوں طرح سے خدا تک رسائی ممکن ہے یعنی فکر خویش ہو یا سائنسی تحقیق (ذرہ شگافی) دونوں ہی خداشناسی کے ذرائع ہیں:

در فکر خودم معنی او چہرہ کشا شد
خورشید برون ریختم از ذرہ شگافی

اور جولوگ عرفان نفس یا آفاق شناسی سے دور ہیں بیدل ان سے کہتے ہیں کہ ذرا غور کرو، گریبان میں جھانکو یہ جونفس (سانس) کا غبار ہے یہ جو سانس چل رہا ہے اور دل دھڑک رہا ہے یہ کس کی فوج پریڈ کررہی ہے:

زاوج افلاک اگرنداری حضور اقبال بی نیازی
نفس بہ جیبت غبار دارد ببین سپاہی کہ می خرامد

خواہ آخرت ہو یا دنیا ایک وہم ہے خیال ہے۔ تم رہو، یہ دونوں جہان رہیں یا نہ رہیں:

چہ دنیا چہ عقبیٰ خیال است بیدل
تو باش این و آن گر نباشد نباشد

ایک تمہارا ہی نقش ہے (جو حقیقی ہے) اگر اسے سنوارو تو پھر تم ہی تم ہو:

ھمین نقش توئی گر بر تراشی
تو باشی و تو باشی و تو باشی

کلامِ بیدل

میں

حیات وموت اور وقت کے تصورات

بیدل اور حیات وموت کے تصورات:

بیدل شاعر حیات ہیں سو حیات وموت کے مضامین بیدل کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہیں۔ زندگی کی مختلف کیفیتوں اور جہتوں کو انہوں نے شعروں میں اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح موت کے بارہ میں حقائق بھی اشعار کی زبان میں بیان کئے ہیں۔ ان کی نظر میں زندگی عارضی بھی ہے:

از ہوا برپا است بیدل خانۂ وہم حباب
در لباس ہستی ما جز نفس یک تار نیست

یعنی زندگی گویا بلبلہ کی طرح ہوا پر قائم ہے' ایک سانس پر زندگی کا دارومدار ہے:

ہیچ کس چون ما اسیر بی تمیزیہا مباش
مشت خاکی در گرہ داریم کاین آب بقاست

یعنی ہم کتنے احمق ہیں کہ ایک مٹھی مٹی ہمارے پاس ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ آب حیات ہے ___ چند لمحوں کی زندگی ہے بلکہ ایک سانس پر زندگی قایم ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کے لیے دنیا میں آگئے ہیں۔

زندگی سراپا دکھ بھی ہے اور اس مضمون کو بھی مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے:

آسمان عمری است مینای مرا
می زند برسنگ و می گوید خموش

یعنی ایک مدت سے آسمان میری مینا کو پتھر پر مار رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ خاموش رہو۔

☆☆☆

چشم وا کردم و طوفان قیامت دیدم
زندگی روز۔ جزا ہست کہ من می دانم

یعنی آنکھ کھولی تو قیامت کا طوفان دیکھا زندگی ایک قیامت ہے جسے میں جانتا ہوں۔

☆☆☆

مطلبی گر بود از ہستی ھمین آزار بود
ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

☆☆☆

گاہ در چشم تر و گہ برمژہ، گاہی بخاک
ھمچو اشک نا امیدی خانہ بر دوشیم ما

☆☆☆

سر شکم، درد آہم، شعلہ ام، داغ دلم، بیدل
چو شمع از حاصل ہستی سراپایم ھمین دارد

☆☆☆

رنج دنیا، فکر عقبیٰ، داغ حرمان، درد دل
یک نفس ہستی بدوشم عالمی را بار کرد

☆☆☆

بندگی، شاہی، گدائی، مفلسی، گردنکشی
خاک عبرت خیز ما صد رنگ تہمت می کشد

☆☆☆

دنیا الم غفلت و عقبیٰ غم اعمال
آسودگی از ما دو جہان فاصلہ دارد

☆☆☆

چہ بار جان کنی ای زندگی کہ ھمچو حباب
تمام آبلہ بر دوش کردہ ای ما را

☆☆☆

زندگی جو گزر گئی وہ ختم ہو گئی، ہم اسے شمار کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ہم اتنے سال کے ہو گئے___ اس حقیقت کو یوں پیش کیا کہ عمر نے کتنی جلدی ہمیں دیوانہ بنا دیا حالانکہ جب آدمی کافی بوڑھا ہو جائے تو آشفتہ دماغی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس آشفتگی میں تو جوان بھی شامل ہیں کہ عمر نے ہماری سانسوں کو جلا دیا ہے اور ہم اسے شمار بھی کر رہے ہیں اور سالگرہ کی تقریب منا رہے ہیں:

عمر از چہ شتاب این ہم آشفتگی انگیخت
کاتش بہ نفس در زد و بگرفت شمارش

زندگی آرزوؤں اور خواہشوں کا نام ہے:

زندگی محمل کش وھم دو عالم آرزوست
می تپد درھر نفس صد کاروان بانگ درا

یاد آن غفلت کہ از گرد متاع زندگی
عمر دامن چیدہ بود و ما دکانی داشتیم

زندگی کا مقصد ہے کہ ہم تفسیر کاف ونون کریں یعنی کن سے کائنات تخلیق ہوئی ہے۔ہم بھی اپنی تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور زندگی کو حسین اور پر معنی بنائیں:

زندگی را صفحہ انشای قدرت کردہ اند
تا نفس پر می زند تفسیر کاف و نون کنید

زندگی کی زینت محبت اور حسن ہیں، ہمیں ان اقدار کو حاصل کرنا چاہئے:

زیب ہستی چیت غیر از شور عشق و ساز حسن
نکہت گل گر نہ ای دود دماغ عود باش

مصائب حیات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، زندگی ہوگی تو اچھے دن بھی آہی جائیں گے۔''ان مع العسر یسرا'' اسے یوں کہا کہ زندگی ہونی چاہئے اسباب طرب مٹتے نہیں، خزاں میں رنگ چمن اڑ جاتا ہے لیکن بہار کے پاس تو رہتا ہے۔وہ باغ کو دوبارہ رنگین و پر بہار بنا دیتی ہے:

زندگی می باید اسباب طرب معدوم نیست
رنگ ہر جا رفتہ باشد در نظر دارد بہار

تصویر مرگ بیدل کی نظر میں

موت بیدل کی نظر میں ایک تو خود زندگی کے لئے ضروری ہے کہ بقول غالب ؎

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بیدل کہتے ہیں: زندگی گر عشرتی دارد امید مردن است

موت کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ ذرہ خورشید اور قطرہ دریا میں مل جاتا

ہے۔اسے بیدل نے یوں کہا:

زین بادیہ رفتم کہ بسر چشمہ خورشید
چون سایہ بشویم زجبین گرد سفر را

کہ میں اس دشت یعنی اس دنیا سے سرچشمہ خورشید پر پہنچا اور وہاں میں نے گرد سفر سایہ کی طرح دھوئی، سورج کے سامنے سایہ فنا ہو جاتا ہے اور چشمہ خورشید حق کے سامنے میرے وجود کا سایہ فنا ہو گیا یعنی حق سے وصال ہو گیا ___ موت کی حقیقت سب جاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی اس حقیقت کو آج تک نہ جان سکا۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انسان میں ہے

بیدل کہتے ہیں:

آنچہ زین دریا ہمی آید بدست
گوہر تحقیق نایاب فنا است

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ اس نیرنگی کے قربان کہ فنا کے راز کو جاننا تو میں چاہتا تھا لیکن کہہ دیا گیا شرار کے کان میں اور ہم بیدل کے انداز بیان کے قربان کہ نہ کہنے کے باوجود یہ بات تو بتا دی کہ زندگی مثل شرار ہے ایک آن کی، ایک لمحہ کی:

داغ نیرنگم کہ در اندیشۂ رمز فنا
منتظر من بودم و گفتند در گوش شرار

اور مرنے کے بعد بھی آشوب زندگی سے کب چھٹکارا ملتا ہے۔ زندگی میں بھی امید پر زندہ تھے اور مر کے بھی بخشش اور جنت کی امید لئے ہوئے ہیں:

مرگم نہ کرد ایمن از آشوب زندگی

جمع است رشتہ ہای امل در کفن ہنوز

بیدل اور تصور وقت:

زندگی اور وقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وقت کے بارے میں بیدل کے اپنے تصورات ہیں۔ جو بہت حد تک جدید مغربی مفکرین کے نظریات اور علامہ اقبال کے تصورات کے قریب ہیں۔

میرزا بیدل فکر کی بلندترین سطح پر وقت کی صرف اضافی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بیدل کی نظر میں وقت کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہے۔ گویا انسان کی شخصیت نے وقت کو تشخص بخشا اور وقت نے کائنات کو تشخص عطا کیا:

بیدل چہ ازل' کو ابد' از وہم برون آ

در کشور تحقیق نہ صبح است نہ شامی

یعنی اے بیدل ازل کیا ہے اور ابد کہاں ہے' یہ وہم کی باتیں چھوڑ' تحقیق کی دنیا میں نہ صبح ہے اور نہ شام ہے۔

☆☆☆

مژگان تست بست و کشاد طلسم دھر

اے چشم آگہی بچہ غفلت غنودہ ای

یعنی تیری پلکوں سے طلسم دھر کی بست وکشاد ہے گویا انسان نے زمانے کو وجود بخشا ہے' اے آگہی کی آنکھ تو کیوں غفلت میں سوئی ہوئی ہے یعنی علم و آگہی سے کام لو تو معلوم ہو کہ انسان کی اہمیت کیا ہے کیونکہ انسان ہی نے وقت کو تشخص دیا جس سے زمانے کو تشخص ملا۔

بیدل کے تصور وقت میں دنیوی معاملات کے اعتبار سے ماضی اور مستقبل کے مقابلہ میں حال ہی کی اہمیت ہے۔اس حقیقت کی وضاحت میں انہوں نے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ اگر ابد تک ہزار ازل وجود میں آئیں، ہزار بار دنیا پیدا ہو ہمیں کیا، ہماری پونجی تو یہی چند لمحے ہیں جو ہمیں زندگی کے ملے ہیں:

اگر ہزار ازل تا ابد زنند بہم
تعلق من بیدل همین دو دم شمرید

یعنی اگر ہزار ازل بھی ابد تک پیدا ہوں تب بھی میرے لیے تو یہی دو لمحے ہیں جن میں مجھے زندگی ملی ہے:

ہر چہ دارد محفل تحقیق امروز است بس
خاک بر فرق دو عالم دی و فردا کردہ اند

یعنی تحقیق سے جو کچھ ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ آج ہی ہے، گذشتہ کل اور آنے والی کل دونوں ہی معدوم ہیں۔

بیدل این نقد بتاراج غم نسیہ مدہ
کار امروز کن امروز، ز فردا فردا

یعنی اے بیدل نقد کی اہمیت ہے اسے ضائع نہ کرو جو کام آج کرنا ہے آج کرو اور آنے والی کل کا کام کل کو کرنا ___ اور وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ کرنے ہیں اس لئے جو کچھ کرنا ہے جلد کرلو وقت تیزی سے گزر رہا ہے:

من نمی گویم زیان کن یا بہ فکر سود باش
ای ز فرصت بی خبر درھرچہ باشی زود باش

بیدل
اور
تصورِ حسن و عشق مجازی

بیدل کے ہاں حسن حقیقی یعنی خداوند حقیقی کی تجلیات اور ذرے سے آفتاب تلک اس کی جلوہ فرمائیوں کا تو ذکر ہے ہی، لیکن ان کے کلام میں حسن کے ایسے پہلوؤں کا ذکر بھی ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ بیدل کے دل میں حسن مجازی اور عشق مجازی کے لیے بھی نرم گوشہ موجود تھا۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں یہ آنکھیں جو تماشائے حسن کی حسرت لئے ہوئے ہیں، اے حسینان خوش نظر تمہارا گھر بن گئیں، کیا خوب ہوا:

این دیدہ کہ حسرت کدۂ شوق تماشا ست
ای خوش نگہان جای شما شد چہ بجا شد

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ میں نے گل آئینہ کی طرح اپنی آبرو ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ اے حسینان لالہ رخ مجھے بھی رنگ تماشا عطا ہو یعنی حسینان گل رخ کے لئے جان و آبرو سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہوں، وہ بھی تو مجھ پر نظرِ التفات کریں اور اپنے جلوۂ حسن سے مجھے نوازیں:

آبروی چو گل آئینہ بر کف دارم
لالہ رویان مگرم رنگ تماشا بخشند

بیدل کا تصور حسن و عشق مجازی بھی نہایت پاکیزہ اور بلند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر

تمہیں پاس ناموس محبت ہو تو بھول کر بھی گل کو بلبل کی رضامندی کے بغیر مت دیکھو:

ای کہ خواہی پاس ناموس محبت داشتن

شرم دار از دیدن گل بی رضائے عندلیب

حسن بے شرم کی یوں مذمت کرتے ہیں کہ بے شرم حسن بوالہوسوں کے ہجوم کی وجہ سے قیامت کا سماں پیدا کر دیتا ہے' وہ باغ جو بغیر در کے ہو (دروازے کے بغیر یعنی چار دیواری کے بغیر ہو) گلچین سے محفوظ نہیں رہ سکتا:

حسن بے شرم از ھجوم بوالہوس محشر شود

ایمن از گلچین نباشد باغ چون بی در شود

میرزا بیدل نے حسن کے ایک بہت ہی پاکیزہ' لطیف اور نازک پہلو کو یوں بیان کیا ہے کہ حسن پاکیزہ کی حیا تو دامن ادب ہاتھ سے کبھی چھوڑتی ہی نہیں اور واقعی پانی کی مٹھی سے گوہر چھیننا بڑا مشکل ہے:

حیا زکف ندھد دامن ادب بیدل

گرفتن گھر از مشت آب دشوار است

ایک اور شعر میں یوں فرماتے ہیں کہ حسن پاس ناموس حیا میں بھلے پانی پانی ہو جائے لیکن آرزوئے دل کا اظہار کبھی اشارتاً بھی نہیں کرتا:

آب گردیدن موجی ز تمنا نزدن

پاس ناموس حیائی است کہ من می دانم

بیدل کہتے ہیں کہ حسینوں کا انداز بھی عجیب نازک ادا واقع ہوا ہے' شوخی جب عرق آلود ہو جائے تو اسے حیا کا نام دیتے ہیں ___ ''شوخی آنجا تا عرق آلود می گردد حیا است'' میں حسرت موہانی نے اردو میں جو اس رنگ کی شاعری کی ہے اس کی ایک جھلک موجود ہے

لیکن بڑے ہی رمزیہ انداز میں اور بڑے ہی رکھ رکھاؤ کے ساتھ:

شیوہ خوبان عجب نازک ادا افتادہ است
شوخی آنجا تا عرق آلود می گردد حیا است

اسی رنگ کا ایک شوخ سا شعر ملاحظہ ہو:

گفتم ای مہ بارقیب روسیہ کمتر نشین
زیر لب خندید و گفت او نیز می گوید ھمین

یعنی میں نے کہا کہ اے چاند (محبوب) تو روسیاہ رقیب کے ساتھ زیادہ نہ بیٹھا کر، مسکرا کر اس نے کہا کہ وہ بھی تو یہی کہتا ہے۔

ہجر و وصال کے مضامین کے بیان میں یہ اشعار خوب ہیں:

دلدار گذشت و نگہ باز پسین ماند
در رفتن او آنچہ زما ماند ھمین ماند

یعنی محبوب چلا گیا' اس کی نظریں پیچھے مڑ کر دیکھتی رہیں۔اس کے جانے میں ہمارے لیے جو رہا یہی رہا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔

☆☆☆

نتوان کشید دامن ز غبار مستمندان
بخرام و نازہا کن سرما و خاک پایت

یعنی خاکساروں (عاشقوں) کے غبار سے دامن کو نہیں بچایا جا سکتا' آپ آیئے ناز فرمایئے ہمارا سر ہے اور آپ کے پاؤں کی مٹی۔

ایک شعر میں کیا ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے' فرماتے ہیں کہ ہم نے چشم انتظار میں ایک اشک کا موتی پالا تھا کہ اچانک تمہیں دیکھا تو وہ موتی نظر کے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا:

گوہر اشکی کہ پروردم بچشم انتظار
در تماشای تو از دست نگہ غلطید و رفت

عشق مجازی ہی کے ضمن میں میرزا بیدل کا ایک خوبصورت شعر یہ بھی ہے:

آنچہ نتوان داد جز در دست محبوبان دل است
و آنچہ نتوان ریخت جز در پای خوبان آبرو است

یعنی محبوبوں کو جو چیز دی جا سکتی ہے وہ دل ہے اور جو چیز ان پر نچھاور کی جا سکتی ہے وہ عزت و آبرو ہے۔

کلامِ بیدل
میں
اخلاق و موعظت کے مضامین

بیدل ایک مرد صاحب دل بھی تھے اور صوفی صاف دل بھی۔ ان کے ہاں عشق مجازی کی شاعری میں بھی ایک اخلاقی پابندی' ایک تہذیبی رچاؤ ملتا ہے جو اس بات کو ثبوت ہے کہ وہ اخلاقیات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ وہ سعدی تو نہیں تھے۔ انہوں نے کوئی گلستان یا بوستان تصنیف نہیں کی ہے لیکن ان کے جذبۂ انسان دوستی' ان کی دین پسندی' ان کا صوفیانہ مسلک اور ان کے اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ان کی غزل میں عام عشقیہ مضامین کے بیان میں بھی اخلاقی اقدار کا پاس اور لحاظ زیادہ ملتا ہے۔ ان کی نظر میں خلق کریم زندگی کی ایک بنیادی قدر ہے۔ اس لئے وہ اپنی غزل میں بھی اخلاقی اقدار کو پیش کرتے ہیں۔

بیدل کہتے ہیں میں نے جو کچھ کیا ہے وہ بے رغبت و نفرت کیا ہے اور یہ بات درحقیقت اخلاق اعلی کی بنیاد ہے کہ انسان جو کام کرے بغیر لالچ اور بغیر خوف کے کرے:

ھر چہ از دست من آمد بیدل
ہمہ بی رغبت و نفرت کردم

بیدل کہتے ہیں اپنے اخلاق سے ایک مخلوق کو مسخر کیا جا سکتا ہے:

در کف اخلاق تست رشتۂ تسخیر خلق
غافل از احسان مباش ہیچ کست بندہ نیست

بیدل کہتے ہیں انکسار و تواضع سے تو دلوں سے کینے دھوئے جاسکتے ہیں۔ اس شیشہ سے پتھر کی گرہ کھولی جاسکتی ہے۔ یعنی پتھر دل کو بھی موم کیا جاسکتا ہے:

کلفت زدای کینۂ دلہا تواضع است
زین شیشہ می توان گرہ سنگ باز کرد

اگر چہ بیدل تواضع اور نکسار کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی ایک متواضع شخصیت کے مالک تھے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے سے کمتر لوگوں سے عجز و انکسار سے پیش آنا چاہئے اور ہمسروں یا برتر لوگوں کے سامنے البتہ اپنا سر اونچا رکھنا مناسب ہے:

با عاجزان فروتنی آثار عزت است
از ہر کہ ہمسر تو نباشد فزون مباش

☆☆☆

عاجز کشی است شیوہ ابنای روزگار
بیدل بچشم خیرہ نگاہان زبون مباش

ایک شعر میں بیدل کہتے ہیں کہ عالم اخلاق میں جو کچھ ہے وہ صرف ایثار ہے۔ اگر آستین سے ہاتھ ہی مدد کے لئے نکال لو تو بڑی بات ہے۔ یعنی آستین (جیب) سے روپیہ پیسہ نہ نکالو تو کوئی بات نہیں ہاتھ ہی سے کسی کی مدد کر دو تو بڑی بات ہے۔ دوسروں کے لئے کچھ تو کرو:

ہر چہ دارد عالمِ اخلاق بی ایثار نیست
دست بسیار است گر از آستین بیرون کنید

بیدل عیب پوشی کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو دوسروں کی عیب پوشی کرتا ہے اللہ اس کی عیب پوشی کرتا ہے:

کسی کو نیک و بد ہوشیار و مست بپوشد
خدا عیب وی از چشم ہر کہ ہست بپوشد

حرص کی مذمت یوں کرتے ہیں کہ مرد حریص صرف غم وغصہ ہی کھاتا ہے سیر چشمی ہی درحقیقت بادشاہی ہے۔ حرص کی وجہ سے ہم بہت غیر ضروری اشیا جمع کر لیتے ہیں۔ تم دولت کی ہوس میں جان کنی کے عالم میں ہو اب قبر ایک نگینہ ہے جو تمہارے نام پر کندہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی تمہارے لئے قبر کھودی جا سکتی ہے بالفاظ دیگر اب تو موت ہی تمہاری حرص کا علاج ہے:

از مایدۂ بی نمک حرص پرسید
چیزیکہ بجز غصہ توان خورد محال است

☆☆☆

بادشاہی در طلسم سیر چشمی بستہ اند
کاسۂ چشم گداگر پر شود جام جم است

☆☆☆

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

☆☆☆

ای بسکہ بہ تحصیل غنا حرص تو جان کند
قبر است نگینی کہ بنام تو توان کند

بیدل کہتے ہیں کہ ایسی دولت مندی چھوڑ دے جو تمہیں اپنے دوستوں کا دشمن بنا دے چونکہ جو لوگ دولت مند بن جاتے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے غریب دوستوں کو سلام

کرنا چھوڑ دیتے ہیں:

بگذر زغنا تا نشوی دشمن احباب
اول سبق حاصل زر ترک سلام است

بیدل کی نظر میں دولت بہت بری بھی نہیں۔ اگر محنت سے دولت کمائی جائے تو غربت سے افضل ہے' اس حقیقت کو اس شعر میں یوں پیش کرتے ہیں کہ کوشش کرو تا کہ اپنی تمنا کو پا سکو' فقر و غربت کو کیوں زنجیر پا بناتے ہو:

جهد تا رهبر تمنا باشد
فقر زنجیر پا چرا باشد

بیدل کہتے ہیں کہ اگر نور دل کی تمنا ہے تو مظلوموں کے دل کا غبار مت بنو' آئینہ ایسی جگہ پر رکھنا چاہیے جہاں آہ نہ ہو (کہ آہ سے آئینہ دھندلا ہو جاتا ہے):

نور دل خواهی غبار طبع مظلومان مباش
بایدت آئینه جایی برد کانجا آه نیست

مظلوموں کی آہ سے ڈرنا چاہئے کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو بارگاہ حق سے قبولیت استقبال کرتی ہے:

بترس از آه مظلومان که هنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بهر استقبال می آید

بیدل آبرو' عزت اور غیرت و خودداری کی حفاظت کی تلقین یوں فرماتے ہیں کہ ہمت بلند رکھو' کچھ بھی ہو اپنی عزت کی حفاظت کرو' بے عزتی برداشت کر کے کوئی کام نکلتا ہو تو ہرگز ایسا نہ کرو:

همت بلند دار که اسبابِ اعتبار
بی عزتی است آنچه نیاید بکار برد

خون کے سو سمندروں سے گزرنا پڑے تو بے تامل گذر جاؤ لیکن ایک قطرے کے برابر یعنی ذرا سی بے آبروئی سے نہ گذرو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی آبرو پر ذرا سی آنچ بھی نہ آنے دو خواہ تمہیں اس کے لئے کیسے ہی نقصانات برداشت کرنا پڑیں:

بی تامل می توان طی کرد صد دریای خون
لیک نتوان از سر یک قطرہ آبرو گذشت

ہاں البتہ صرف حسینوں کے قدموں پر آبرو نچھاور کی جا سکتی ہے:

آنچہ نتوان داد جز در دست محبوبان دل است
آنچہ نتوان ریخت جز در پای خوبان آبروست

خواہشات ہی انسان کے بے آبرو بننے کا سبب بنتی ہیں، گویا شکست آرزو میں آبرو کی تعمیر و تشکیل ہے:

در شکستِ آرزو تعمیر چندین آبروست
شبنم ایجاد است اگر موجِ ہوا خواہد شکست

بیدل کہتے ہیں کہ اس عہد میں پست فطری اور بد طینتی کی وجہ سے ہر شخص کسب کمال روٹی کے لئے کر رہا ہے:

درین زمانہ ز بس طبع دون رواج گرفت
عنان کسب کمالات سوی نان گردید

بیدل کہتے ہیں کہ کیا اچھا ہو کہ اگر تمہیں بلند مراتب کے حصول کی خواہش ہو لیکن جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو تمہارا دماغ نہ پھر جائے:

چہ خوش است اگر بود آنقدر ہوس بلندی منظرت
کہ بر آن مکان چو قدم نہی خم گردشی نخورد سرت

مندرجہ ذیل پوری غزل ہی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کی حامل ہے۔ بیدل کہتے ہیں کہ کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جاؤ خاکساری کو نہ چھوڑو، پتھر کی طرح مت بنو بلکہ رنگ کی طرح سبک بنو اور رخ بہار پر بیٹھو۔ یہ تماشا گاہ آنکھ کی طرح نازک ہے۔ نظر کی طرح بیٹھو جہاں بیٹھو۔ اگر اپنی ذات سے یعنی مفادات سے آزادی حاصل کر لی تو سارا جہاں محبت کدہ ہے اور اگر اپنی ذات کے بندھن میں پھنسے ہوئے ہو تو سارا جہاں غبار غم سے لبریز ہے۔ تم جو خود پر غرور کرتے ہو ایک ذرے سے بھی کمتر ہو۔ اپنی ذات کے زندان سے نکل آؤ اور دنیا کی آنکھوں اور سر پر بیٹھ جاؤ:

غزل

برون چو گرد ز دامان اعتبار نشین
سرت اگر بہ فلک سود خاکسار نشین

درین بساط گران خیز ہمچو سنگ مباش
سبک چو رنگ شو و بر رخ بہار نشین

تمام خانہ چشمی است، این تماشا گاہ
بہر کجا نشینی نگاہ وار نشین

جہاں صفا کدۂ تست گر ز خود رستی
و گر بہ بند خودی در دل غبار نشین

کم از غبار تنی ای بخود سری مشتاق
ز خو بر آ بسر و چشم روزگار نشین

بیدل کہتے ہیں کہ زندگی میں گداز دل کی سیر بڑی چیز ہے، تیرے دل کا خون ہونا وہ رنگ رکھتا ہے جو سارے چمن میں نہیں ہے۔ حالی نے جو کہا تھا:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

تو بیدل اسے یوں کہتے ہیں:

غافل از سیر گداز دل نباید زیستن
ہست درخونِ گشتنت رنگی کہ درگلزار نیست

تحقیق و آگہی کلامِ بیدل کی جان ہے۔ میرزا بیدل نے اپنے کلام میں تقلید و روایت پرستی کی سخت مذمت کی اور تحقیق وحصول آگہی کی بے حد تلقین کی ہے۔ ادراک حقیقت کی طلب ان کے ہاں تڑپ کی حد تک ہے۔ اس راہ میں ہر شے آئینہ دار حیرت ہے۔ یہ حیرت بوجہ جہل نہیں بلکہ بسبب آگہی ہے جسے متصوفین حیرت محمود کہتے ہیں اور بیدل نے اسے حیرت ادراک کہا ہے:

دل انجمنِ محرمِ بیگانہ نباشد
جز حیرتِ ادراک درین خانہ نباشد

اس کے علاوہ ان کی نظر میں حواس ظاہری سے حقائق کا ادراک ممکن نہیں اس لئے حواس روحانی یا بیخودی یا عشق یا بصیرت درکار ہے:

ای کہ از فہم حقائق دم زنی خاموش باش
عمرھا باید کہ دریابی زبان خویش را

یعنی تم جو فہمِ حقائق کی بات کرتے ہو چپ رہو ایک عمر چاہیے کہ تم اپنی زبان (یعنی بات صحیح طور پر کہنے کی صلاحیت) پاؤ۔

☆☆☆

جمعیت حواس در آغوش بیخودی است
از ہوش بہرہ نیست کسی را کہ مست نیست

یعنی حواس بیخودی کی آغوش میں جمع ہوتے ہیں، وہ شخص جو بے خود نہیں وہ دانش و ہوش بھی نہیں رکھتا۔

☆☆☆

تبعیت خلق از حقت غافل کرد
ترک تقلید گیر تحقیق این است

یعنی لوگوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے تم حق سے دور ہو گئے ہو، تقلید چھوڑ دو گے تو محقق بنو گے۔

بیدل کہتے ہیں کہ جب حیرت ظاہر ہوئی تو انسان نے آئینہ ایجاد کیا۔ دھاگے میں گرہ پڑی تو موتی بنے:

حیرتی روداد دل اندیشۂ آئینہ کرد
عقدہ ای در رشتہ ظاہر گشت و گوہر ریختند

اور جس وقت حسن خودنمائی کی طرف مائل ہو جائے تو پتھر میں بھی نظر پیدا کر دیتا ہے:

دمی کہ حسن کند میل خود نمائی ھا
ز طبع سنگ تواند نگاہ پیدا کرد

اور یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ انسان نے کبھی نبی کی حیثیت سے، کبھی مصلح کے رنگ میں، کبھی ایک انقلابی کے روپ میں نسل انسانی کو سنوارنے، نکھارنے کی کوشش کی ہے اور سینکڑوں بار اس مقصد کے حصول کے لئے خونریز جنگیں بھی لڑی ہیں، لاکھوں انسان

قتل بھی ہوئے لیکن ہنوز روز اول والا معاملہ ہے کیونکہ اصلاح کی ہر کوشش اور ہر جدو جہد ہماری ہوا و ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ہر تحریک کے شروع میں کچھ اصلاح احوال ہوتی ہے لیکن پھر خود غرضی غالب آجاتی اور وہی پہلے والا حال ہو جاتا ہے۔ بیدل نے اس کو مختصراً یوں کہا کہ میری ہوا و ہوس کی غفلت کی بدبختی ملاحظہ کیجئے کہ میں یا میرا اشوقِ جہاں آرائی خون میں تڑپا بھی پھر بھی ابھی تک چمن نہ بنا:

از بی نصیبی من غفلت ہوا مپرس
در خون طپید شوق و نگشتم چمن ہنوز

اور یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ یہ جہان، یہ ہماری موجودہ دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں اور ہمہ جہتی ترقیوں کے باوجود مستقبل کی دنیا کے مقابلے میں ناقص و ردشدہ ہے، گویا آج کی محفل میں جو رونق ہے یا یوں کہئے جو شمع روشن ہے، وہ درحقیقت ایک جلا ہوا خیال ہے "شمع خیال سوختہ" ایک بڑی فکر انگیز ترکیب ہے اور جلوہ گاہ کے حوالے سے تو اور بھی پر معنی ہو گئی ہے۔ گویا جیسے کوئی مکان تعمیر کرنا ہو یا کسی کے استقبال کے لئے کوئی جلوہ گاہ یا اسٹیج بنانی ہو تا کہ اس عظیم ہستی کو استقبالیہ دیا جائے لیکن مکان، جلوہ گاہ یا اسٹیج بنانے سے پہلے بہت سے نقشے ذہن میں آتے ہیں بلکہ کاغذ پر تخمینی نقشے بنائے جاتے ہیں (جب تک صحیح نقشہ ذہن میں نہ آئے) اور پھر یہ نقشے رد کر دیئے جاتے ہیں بلکہ جلا دیئے جاتے ہیں۔ ان ردشدہ خیالوں یا نقشوں کے جلنے سے روشنی بھی ہوتی ہے، گویا یہ شمع روشن ہوتی ہے جو ہماری اس محفل یا آج کی دنیا کی رونق ہے۔ دنیا جو کل تھی آج کے مقابلے میں ردشدہ اور ناقص ہے، اسی طرح آج کی دنیا آنے والے کل کے مقابلے میں ردشدہ اور ناقص نظر آئے گی اور یہ دنیا ہر آن ترقی کر رہی ہے، ارتقاء کی منزلوں کی طرف گامزن ہے اور ساتھ ہی خدائے وحدہ لاشریک لہ کی تجلیات کی جلوہ گاہ بھی ہے اور "کل یوم ہو فی شان" کی آئینہ دار بھی، ان حقائق

کی روشنی میں میرزا بیدل کے اس شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ دنیا اپنی تمام نظر افروز اور دل کش رعنائیوں کے ساتھ نہ جانے کس کی جلوہ گاہ ہے کہ انجمن ابھی تک ایک جلے ہوئے خیال کی شمع ہے:

عالم باین فروغ نظر جلوہ گاہ کیست؟

شمع خیال سوختہ است انجمن ہنوز

اور ذرا اس حقیقت کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ آج ہمارا لباس، ہماری رسوائی کا سبب ہے اور ایک زمانہ تھا کہ جب عریانی ہماری پردہ دار راز تھی یعنی آج ہمارے لباس سے ہماری معاشرتی حیثیت متعین ہوتی ہے اور یوں لباس ہمارا راز فاش کر دیتا ہے کہ ہم کس حیثیت کے آدمی ہیں اور آج سے لاکھوں سال پہلے جب لباس ایجاد نہیں ہوا تھا اور انسان ننگا ہی پھرتا تھا، اس وقت ہماری عریانی ہماری حیثیت کی ایک طرح سے پردہ پوشی کرتی تھی:

در خور کسوت کنون خجلت کش رسوائیم

عمرہا عریانی من پردہ دار راز بود

ایک اور حقیقت بھی تو ہے: حادثے باعث تشویش نہیں ہوتے بلکہ ان کا خوف اور ان کے بارے میں سوچنا ہمارے صبر و استقامت کو مٹا ڈالتا ہے یعنی حادثہ اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا اس کے آنے سے پہلے اس کا خوف، انسان سوچ سوچ کر اپنی توانائیوں اور صبر و استقامت کو ختم کر دیتا ہے:

حادثات آنہمہ تشویش ندارد بیدل

صبر زحمت کش اندیشۂ بیداد مباد

میرزا بیدل نے اپنے کلام میں فلسفہ اور تصوف کی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ آئینہ، طاؤس، عنقا، حباب، گل، شمع کے الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ یہ الفاظ تشبیہاً بھی

استعمال ہوئے ہیں اور استعارتاً بھی اور بطور علامت بھی۔ ہر بڑے شاعر کے ہاں کچھ الفاظ ہوتے ہیں جنہیں وہ بطور علامت اپنے کلام میں لاتا ہے۔ یہ الفاظ' یہ علامتیں خود اس کی شخصیت' اس کے مقصد حیات اور اس کے پیغام کی عکاس یا ترجمان بھی ہوتی ہیں۔ جس طرح علامہ اقبال کے کلام میں لالہ اور شاہین ہیں' اس طرح بیدل کے کلام میں آئینہ' طاؤس اور عنقا ہیں۔ آئینہ اور طاؤس اس عالم مادی یعنی جہان رنگ کا استعارہ ہیں اور عنقا عالم روحانی یا ذات حق کی علامت ہے:

عمر ہا شد در فضای بی نشان پر می زنم
آشیان در عالم عنقاست اوہام مرا

یعنی ایک مدت سے فضائے بے نشان میں محو پرواز ہوں' میرے اوہام کا آشیاں عالم عنقا میں ہے۔

☆☆☆

پروانہ شوم یا پر طاؤس گشایم
از عالم عنقا چہ خیال است بر آیم

یعنی میں پروانہ بنوں یا طاؤس کے پر کھولوں' کیا تمہارا خیال ہے کہ میں عالم عنقا سے باہر آسکتا ہوں یعنی کتنی کوشش کروں عالم عنقا سے باہر نہیں جا سکتا۔

☆☆☆

این انجمن ہنوز ز آئینہ غافل است
حرف زبان شمعم و روشن نگفتہ ام

یعنی یہ انجمن ابھی تک آئینہ سے غافل ہے' میں شمع کی زبان کا حرف ہوں جو واضح طور پر میں نہیں کہہ سکا۔

اس کے علاوہ روایات شعری، استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعے سے آئینہ، طاؤس اور عنقا کے الفاظ کو نئے نئے جہان معانی عطا کئے ہیں۔ خود آئینہ فارسی ادب میں ایک آنکھ ہے جو بے نم ہے، ایک قطرۂ اشک ہے، ایک دل بھی ہے، تصوف میں کائنات کا استعارہ بھی ہے۔ میرزا بیدل نے کئی غزلیں آئینے کے ردیف کے ساتھ لکھی ہیں اور نئے نئے معانی پیدا کئے ہیں۔ مثلاً

امروز کیست مست تماشای آئینه
کز ناز موج می زند اجزای آئینه

آج کون مست تماشائے آئینہ ہے کہ آئینہ کے سارے اجزا ناز سے موج میں آرہے ہیں۔ اس شعر کا مفہوم مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی حسین آئینے کے سامنے ہو تو اہل دل اور اہل نظر اس شعر کا بہتر ادراک کر سکتے ہیں:

آنجا که دل طرب کدۂ عرض نازہاست
خوبان چرا کنند تمنای آئینه

میرزا بیدل کہتے ہیں کہ حالانکہ میرا دل تو طرب کدہ ناز ہے پھر حسینان جہان کیوں آئینہ کو دیکھتے ہیں یعنی آئینہ تو شفاف پتھر اور بے جان ہے صرف تصویر پیش کر دیتا ہے جب کہ میرا دل تو محبوب کے ناز و انداز پیش کرنے کا طرب کدہ ہے۔ میرے دل کے آئینے میں تو ان کی ادائیں بھی منعکس ہوتی ہیں:

بوی وصلی ہست در رنگ بہار آئینه
میگدازم دل که گردم آ بیار آئینه

محبوب آئینہ دیکھ رہا ہے آئینے میں جو محبوب کی تصویر نظر آرہی ہے گویا وصال ہی کی ایک صورت ہے جو آئینے کو حاصل ہے۔ گویا رنگ بہار آئینہ وصل کی خوشبو رکھتا ہے۔

یہاں رنگ بہار آئینہ کی ترکیب بڑی معنی خیز اور فکر انگیز ہے یعنی محبوب کی تصویر نے آئینے کو بہار کا رنگ عطا کیا ہے اور بہار کا خوشبو سے تعلق ہے۔ آئینہ میں رنگ و بو دونوں کا امتزاج ہو گیا ___ اس لئے مجھے بھی اپنے دل کے آئینے کو محبوب حقیقی کی حقیقی تصویر کے لئے تیار کرنا چاہئے جسے بیدل نے پگھلانا یا گداز کرنا کہا ہے۔ یعنی محبت یا دل گدازی انسانیت کی اعلیٰ قدر ہے۔ یہ خصوصیت یعنی دل گدازی ہو گی تو محبوب حقیقی کی تصویر دل کے آئینہ میں اتر آئے گی۔

حباب، شمع اور گل بھی میرزا کے کلام میں عام ملتے ہیں۔ حباب زندگی کی ناپائیداری کا استعارہ ہے لیکن بیدل نے مختلف معانی پیدا کئے ہیں، یہ سر بگریبان ہونے کی بھی صورت ہے ___ بیدل کہتے ہیں کہ عالم دل کی سیر سے ہم غافل ہیں ورنہ حباب اگر اپنے سر کو اپنے گریبان میں ڈال دے (یعنی غور کرے) تو دریا بن جائے۔ یعنی حباب کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک وہ سر بگریبان نہیں ہوتا جس وقت وہ سر بگریباں ہو جاتا ہے یعنی غور و فکر کرتا ہے تو سمندر بن جاتا ہے:

ز سیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب
سر اگر بگریبان فرو برد دریاست

حباب خود نمائی کا بھی نشان ہے:

در محیط از خود نمائی ہا نمی گنجد حباب
گر نفس بر خود ببالد گوشۂ دل تنگ نیست

حباب گوہر سے برتر ہے، گوہر سمندر کا ورثہ اور حباب صاحب ہمت اور بلند نظر ہے، اپنی زندگی خود بناتا ہے:

مباش ہچو گہر مردہ ریگ این دریا
نظر بلند کن و ہمت حباب طلب

شمع فارسی ادب میں آنکھ کا استعارہ بھی ہے، رونق محفل کا بھی، سوز و درد کا بھی، اشک و آہ کا بھی۔ بیدل کہتے ہیں کہ شمع کے رونے میں رونق محفل پنہاں ہے:

بیدل این محفل نہان در گریہ شمع است و بس
داغ آن زخمم کہ بالب ہای خندان آشناست

میں نے شمع کی طرح ایک عمر شعلوں سے نباہی ہے، تب میں اس قابل ہوا کہ سیر جہان دل گدازی کے ساتھ کر سکوں:

چون شمع روز گاری با شعلہ ساز کردم
تا در طلسم ہستی سیر گداز کردم

شمع کی تصویر کیا خوب انداز میں پیش کی ہے:

داغ زیر پاو آتش بر سرو در دیدہ اشک
شمع را در انجمن بودن چہ جای خرمی است

یعنی پاؤں کے نیچے داغ ہے، سر پر آگ ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں یوں شمع کا انجمن میں ہونا کیسے خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔

گل فارسی ادب میں داغ دل بھی ہے، ہنستا مسکراتا چہرہ بھی ہے، چشم پرنم بھی ہے (اگر پھول پر شبنم ہو)، سینہ فگار، دامن دریدہ اور چاک گریبانی کی نشانی بھی ہے اور بیدل کی نظر میں آبلہ خون چکیدہ بھی ہے۔ بیدل کہتے ہیں، یارب چمن کے دل میں کیسا کانٹا چبھا ہوا ہے کہ جو پھول بھی دیکھا آبلۂ خون چکیدہ نظر آیا ہے:

ہر گل کہ دیدم آبلہ خون چکیدہ بود
یارب چہ خار در دل گلشن شکستہ اند

ملوک وملوکیت اور فارسی کے عوامی شاعر

میرزا عبدالقادر بیدل

میرزا بیدل ایک عظیم شاعر، ایک سچے صوفی اور ایک بلند پایہ مفکر تھے۔ انہوں نے زندگی کو بہت گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اچھے اور برے دن بھی دیکھے تھے یتیمی کا درد، غربت و افلاس کا دکھ سہا تھا۔ وہ دوسروں کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرتے تھے کہ صاحب دل تھے۔ دیدۂ بینا اور دلِ بیدار کے مالک تھے اس لیے میرزا بیدل نے بڑی درد مندی سے عوام کے دکھوں کی ترجمانی کی ہے اور بعض پہلوؤں سے تو ان کی اوّلیت تمام شعرائے فارسی زبان پر مسلّم ہے کہ انہوں نے معاشرے کے چھوٹے اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ کاشتکار، جولاہا، درزی، لوہار اور قصاب وغیرہ کے پیشوں کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی ہمت افزائی کی ہے، ان کو حقیقی احترام وعزت کا سزاوار قرار دیا ہے، بیدل کاشتکار کو سزاوارِ خلعت رزاق کہتے ہیں:

کسب دهقانی ازچه دیدی شاق
ای سزا وارِ خلعتِ رزاق

یعنی اے خلعت رزاق کے لایق تم کاشتکاری کے پیشے کو تکلیف دہ کیوں سمجھتے ہو۔

درزی اور جولاہے کو ستار العیوب کے نام سے یاد کرتے ہیں:

کسبِ خیاط و پیشہء نسّاج
رحمتِ عام دادن است رواج
سّرِ این رشتہ گر بدست آری
گوہر آرای اسمِ ستّاری

یعنی درزی اور جولاہے کے پیشے کا مقصد رحمت عام کو رائج کرنا ہے' اگر تم اس تعلق کے راز کو پالو تو تم ستّار (ستّار العیوب) کے نام کو چار چاند لگانے والے بن جاؤ۔

لوہار اور قصاب کو حق کی صفاتِ جبّاری کا مظہر بتاتے ہیں۔

پیشہ ای کز صفاتِ جباری است
ھم بصد پایہ بہ زبے کاری ست
گر معمای خویش دریابی
پس چہ حدادی وچہ قصابی!

یعنی ایک پیشہ جباری صفات کا حامل ہے وہ بیکاری سے سو درجے بہتر ہے' اگر تم اپنی ذات کے معمے کو حل کرلو تو چاہے لوہار بنو اور چاہے قصاب بنو۔

بیدل جس سچے جوش وجذبے کے ساتھ عوامی مسائل کو پیش کرتے ہیں اور حکمرانوں پر تنقیدِ شدید کرتے ہیں اس سے یوں لگتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی عوامی شاعر ہے جس نے عوام کے دکھوں کو صفحہ قرطاس پر پیش کرنے کے لیے خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبولی ہیں۔ میرزا بیدل نے اپنے دور پر تنقید بھی کی ہے' عوام کے مسائل بھی پیش کئے ہیں' بادشاہوں اور حکمرانوں کے ظلم وستم کے خلاف دہائی بھی دی ہے اور سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کے انہوں نے حکمرانوں اور بادشاہوں کو ڈاکو اور لٹیرا کہا اور یوں غالباً تاریخ ادبیاتِ مشرق میں سب سے پہلے میرزا بیدل نے بادشاہت کی بنیاد پر ضربِ کاری لگائی ہے۔

فارسی شعراعام طور پر یا تو دربار سے تعلق رکھتے تھے یا درگاہ سے، درباری شاعر بادشاہوں کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھتے تھے اور درگاہ سے تعلق رکھنے والے یعنی صوفی شاعر توحید و وحدت الوجود اور دوسرے متصوفانہ مطالب کو شعروں میں ڈھالتے تھے۔ عوامی مسائل سے دونوں ہی کو کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ ویسے بھی کلاسیکل فارسی ادب پر نظم ہو یا نثر، بادشاہ یا بادشاہت کے اثرات بہت وسیع اور گہرے تھے۔ انواعِ شعری میں قصیدہ کا موضوع تو بنیادی طور پر مدح شاہ ہی ہوتا تھا۔ مثنویاں (سوائے عرفانی مثنویوں کے) بادشاہوں کے ذکر ہی پر، بہت حد تک مشتمل ہوتی تھیں یا ان کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے آ ہی جاتا تھا۔ ویسے بھی فارسی شاعری کی یہ بھی روایت رہی ہے کہ مثنوی کے آغاز میں حمد و نعت کے بعد بادشاہ وقت کی تعریف کی جاتی تھی، نثر کی کتابوں مرزبان نامہ، چہار مقالہ، اخلاق محسنی اور گلستانِ سعدی وغیرہ میں بادشاہ کی حیثیت تقریباً مرکزی ہے اور یوں فارسی ادب میں عوام ایک ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ بادشاہوں کی تعریف عام تھی اور بادشاہوں پر تنقید تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ چند شعراء نے حکام کی تعریف کرنے کے بجائے ان پر تنقید کی ہے اور انہیں اخلاقِ حسنہ یعنی عدل و انصاف کرنے کی تبلیغ کی ہے یا کچھ اہل قلم نے معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے، اس میں دو بڑے نام ہیں: ایک سعدی کا دوسرا عبید زاکانی کا۔ ناصر خسرو، سنائی، عطار اور رومی نے اگرچہ بادشاہوں کی تعریف نہیں کی لیکن عوامی مسائل سے یہ حضرات بہت حد تک کنارہ کش رہے۔ سعدی نے جابر بادشاہوں کی شان میں جو قصائد لکھے ان میں بجائے مدح و ستائش کے عبرت و وعظ و نصیحت کے مطالب بڑے ہی اثر انگیز انداز سے بیان کیے ہیں۔ فارسی ادب میں سب سے پہلے انوری نے ایک قطعے میں حکمران وقت پر تنقید کی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز ایک دانا نے ایک نادان سے کہا کہ ہمارا حاکم شہر کیسے بھکاری ہوسکتا ہے؟ اس کی تو ٹوپی کا

ایک تکمہ ہی ہمارے ایسوں کی سالہا سال کی روزی کے لیے کافی ہے۔ اس دانا نے کہا میاں تم غلط سمجھ رہے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سب ساز و سامان آتا کہاں سے ہے؟ اس کے ہار کے موتی ہمارے بچوں کے آنسو ہیں۔ اس کے گھوڑے کے ساز کے لعل و یاقوت تمہارے یتیموں کا خون ہے ___ مانگنا بھیک ہے اسے عشر کہو یا خراج ایک ہی چیز کے دس نام ہو سکتے ہیں لیکن اس چیز کی حقیقت نام سے تو نہیں بدلتی۔ چونکہ مانگنا بھیک ہے اب جو بھی مانگتا ہے خواہ سلیمان ہو یا قارون وہ بھکاری ہے۔

گدا

آن شنیدستی کہ روزی زیر کی با ابلھی

گفت کاین والیِ شہر ماگدای بی حیاست!

گفت چون باشد گدا آن کز کلاہش تکمہ ای

صدچومارا روزہا بل سالہا برگ و نواست ؟

گفتش ای مسکین غلط اینک از اینجا کردہ ای!

آنہمہ برگ و نوا دانی کہ آنجا از کجاست؟

دُرّ و مرواریدِ طوقش اشکِ طفلانِ منست

لعل و یاقوت ستامش خون ایتام شماست

او کہ تا آب سبو پیوستہ از ما خواست است

گر بجوی تا بمغزِ استخوانش از نانِ ماست

خواستن گدیہ است خواہی عشر خوان خواہی خراج

ز آنکہ گردہ نام باشد یک حقیقت را رواست

چون گدایی چیز دیگر نیست جز خواہندگی

ہر کہ خواہد گر سلیمانست و گر قارون گداست

پروین اعتصامی کا مندرجہ ذیل مشہور قطعہ "اشکِ یتیم" انوری کے مذکورہ قطعہ ہی کا عکس معلوم ہوتا ہے:

اشکِ یتیم

روزی گذشت پادشہی از گذر گہی

فریادِ شوق بر سرِ ہر کوہ و بام خاست

پرسید ازان میانہ یکی کودکی یتیم

کین تابناک، چیست کہ بر تاج پادشااست؟

آن یک جواب داد چہ دانیم ما کہ چیست؟

پیداست این قدر کہ متاعی گران بہاست

نزدیک رفت پیرزنی کوژپشت و گفت

کین اشک دیدۂ من و خونِ دلِ شماست

مارا برخت و چوبِ شبانی فریفتہ است

این گرگِ سالہاست کہ با گلہ آشناست

آن پارسا کہ دہ خرد و اسپ رہزن است

و آن پادشہ کہ مالِ رعیت خورد گداست

بر قطرۂ سرشکِ یتیمان نظارہ کن

تا بنگری کہ روشنیِ گوہر از کجاست

پروین بہ کجروان سخن از راستی چہ سود
کو آنچان کسی کہ نر بخد ز حرفِ راست؟

میرزا عبدالقادر بیدل نے اپنے زمانے کے چلن اور فارسی شاعری کی روایت کے برعکس شاہانِ وقت کی قطعاً مدح وستایش نہیں کی ___ شہزادہ محمد اعظم شاہ نے جس کے دربار میں میرزا بیدل اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، قصیدہ لکھ کر پیش کرنے کی فرمائش کی۔ میرزا نے بجائے قصیدہ کے ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف حکمرانانِ وقت پر تنقید کی ہے بلکہ خود وجود بادشاہت اور ملوکیت کے ادارہ کو بھی موضوعِ تنقید بنایا ہے۔ ان کی نظر میں سلاطین دراصل ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ میرزا بیدل نے اپنے دور پر بھی تنقید کی ہے، عوامی مسائل سے بھی اعتنا کیا ہے اور حکمرانانِ وقت کے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے۔

بیدل نے اپنی مثنوی عرفان میں (ص ص ۱۷۸۔۱۷۷) سلاطین وسلطنت کے تصور پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے مخصوص تمثیلی استدلال کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ سلاطین تو درحقیقت ڈاکو ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ جب انسان کے شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے وجود کی احتیاج کے اسرار پالیے، اس نے دیکھا کہ سانس کا رشتہ روٹی سے وابستہ ہے اور اس ماؤمن کے دائرے کا مرکز بھی روٹی ہی ہے۔ روٹی ہی قویٰ کی نشو ونما کا باعث ہے اور قویٰ سے مزاج قوت پاتے ہیں اور مزاجوں سے حواس میں ارتباط قائم ہے اور یہ ارتباطِ حواس عمر کی بقا کا ضامن ہے، جہاں روٹی نہیں وہاں زندگی نہیں، بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے، رونا زندگی کی دلیل ہے اور اس بات کا اظہار بھی کہ وہ بھوکا ہے، جس نے بھی اس چمن میں آنکھ کھولی فوراً منہ بھی کھولا کہ کچھ کھائے۔ آخر کار انسان نے کاشتکاری کا پیشہ اختیار کیا، اس نے گندم کاشت کی لوگوں نے اسے زر دے کر اور غریبوں نے مانگ کر روزی حاصل کی۔

مفلسوں نے خوشہ چینی کی اور منعموں نے خرمن خرید لیے۔ آہستہ آہستہ نکمے' اوباش' بیکار اور بدقماش لوگوں کا منحوس لالچ بجلی بن کر یاٹڈی دل کی طرح کھیتوں پر ٹوٹ پڑا۔ کھیتیاں لوٹ مار سے پامال ہوگئیں، کسان کی منتِ سماجت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر زمانہ بدلا اور بے چارے کاشتکار کو خراج قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ نہ رہا۔ دہقان کی ایک سال کی محنت لٹیرے اور ڈاکو ایک لحہ میں آتے اور لے جاتے اور یوں حرص اور غفلتِ خود کام کے فتوے نے حرام کو حلال قرار دے دیا۔ جس طاقتور نے بھی خرمن دیکھا ماں کا دودھ اور باپ کی ملکیت سمجھ کر لے اڑا۔ اس لوٹ مار سے بچنے کے لیے بیچارے کسان نے ان لٹیروں اور ڈاکوؤں کو خراج دینا قبول کر لیا اور یوں خراج جو لوٹ مار ہی کی ایک صورت تھی حرام سے حلال ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ایک اور فتنے نے جنم لیا، بدمعاش لوگوں کے دلوں میں دولت زیادہ جمع کرنے کی ہوس پیدا ہوگئی۔ انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے شمشیر و خنجر ایجاد کئے' لشکروں کی تشکیل ہوئی اور دوسروں کو مسخر کرنے کی روایت نے جنم لیا' جب ایک فوج نے دوسری فوج کو شکست دی تو اس کا سارا مال و متاع بھی قبضے میں کر لیا اور یوں سلطنت کا تصور اور وجود قائم ہوا۔ اور پھر کیا تھا جوش فرعون اور شوخی نمرود نے اقتدار قائم کرنے کے لیے ہر طرف ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے:

جوش فرعون و شوخی نمرود
ہر طرف بالِ اقتدار کشود

پھر جہالت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے اور دولت نے کیا کیا رنگ نہیں دکھلائے' ان سلاطین کی نظر میں یہ تمام دنیاوی جاہ و حشم بیکار اور بے معنی سے نظر آئے اور آخر کار دعوی خدائی بھی کر بیٹھے:

رائیگاں بود سازِ جاہ و حشم

مفت شد دعوی خدائی ہم

بیدل کہتے ہیں کہ ان لٹیروں نے بادشاہت کا روپ دھار لیا تھا، اپنی غرور سلطنت کی بقا کے لیے عدالتیں قائم کیں گویا حرص کو عدل کا نام دیا، اس عدالت کا بنیادی مقصد یہ تھا کے دہقان کے ساتھ کوئی ظلم نہ کرے یعنی بادشاہ کے مال میں کمی واقع نہ ہو۔ آہستہ آہستہ زمیندار مزدور بن گیا۔ پھر کسی کو جرات نہ ہوئی کہ سر بلند کر سکے یا پھر کھلیان کا طرف نظر بھی ڈال سکے۔ اگر زمیندار بادشاہ کے حصے میں سے ایک تنکا بھی چرالیتا تو اسکا سر قلم کر دیا جاتا۔ یہ اسکی سزا ہے جو کام کرتا ہے اور مخلوق کے لیے خزانوں کے دروازے کھولتا ہے، گویا چشمۂ آب کا مالک ہے اور پیاسا مرتا ہے۔ بادشاہوں کے انصاف کی صورت یہی ہے، یہ تمام تر ظلم ہے، عدل و احسان نہیں۔ یہ خود پرستی ہے ایمان نہیں۔ بادل کے رنگ میں بجلیاں برستی ہیں جو چمن کو جلا ڈالتی ہیں:

یعنی اینجا گروہِ برز گر ند که سراپا نهالِ سیم و زراند

آفتا بند نور پاشِ همه گرمی شعلهء معاش همه

ذات شان مصدرِ حقیقتِ جود فعلِ شان ضامنِ بقای وجود

کرمِ جودِ محفلِ امکاں همه موقوفِ کیسهٔ ایشان

با همه عاجزی برنگِ نفس رشتهء سازِ قدرتِ همه کس

با وجودِ غبارِ وضعِ نیاز عالمی را دلیلِ افسرِ ناز

خاکسارانِ نو بهار انجام نا توانانِ اقتدار نظام

تخمِ اقبالِ مزرع شاهی ریشهء نخلِ کامِ دل خواهی

چیست یا قوت؟ رنگ چیدهٔ شان چه گهر؟ تخمِ آبِ دیدهٔ شان

دولتی پایدار زیر قدم کارِشان سبز و حالشان خرم
هر چه باید ز خاک وا گیرند از فنا مایهء بقا گیرند
آشنای فنا بقا دارد محرمِ خاک گنجها دارد
پیش از آندم کز آشیانِ خیال شوخی ما و من کشد پرو بال
آدم آن تخمِ مزرعِ امکان ریشه داشت در ریاضِ جنان
چون درین تیره خاکدان افتاد آفتابی ز آسمان افتاد
هوش چشمی به امتیاز گشود یافت اسرارِ احتیاط وجود
دید سازِ نفس زدن نان است مرکزِ دور ما و من نان است
نفس از ریشه های الفت اوست زندگی ما به وارِ قوتِ اوست
طفل راچون امید زیستن است اولین پیشه اش گریستن است
هر که چشمی درین چمن واکرد تا مژه واکند دهن وا کرد
جستجو های عالمِ خم وپیچ طلبِ روزی است و باقی هیچ
گشت عشقش دلیل دهقانی کرد ناچار دانه افشانی
جهد ها صرف حاصل نان بود همه کس بهر لقمه دندان بود
آن گهر برد و نان بدست آورد این زر آورد و دانه حاصل کرو
عاجزان نیز التجا بروند تحفه وتی بصد دعا بروند
گشت هر یک خمار یاس شکن مفلس از خوشه، منعم از خرمن
بحر و کان جمله طالب نان شد نیک و بد میهمان دهقان شد
لیک از آنجا که این کهن دهقان بهزار آفت است تخم افشان
نیست زین مزرع سفید و سیاه ایمن از برقِ فتنه هیچ گیاه

خوشه چینانِ کشتِ بیکاری میکشیدند زحمتِ خواری
هر قدر سعی ناتوان گردید حرص غالب شد و حسد بالید
جمع گردید ژاژ خائی چند مختلف خاصیت هوائی چند
که درین مزرع الم حاصل چند خرمن کنیم عقدهء دل
تا بکی رنگ آرزو بازیم عرصه خالیست گر بهم تازیم
زینچنین زندگانی بی سود جز بمرون نمی توان آسود
آفتِ خرمنِ وجود شویم یا بحاصل شریک سود شویم
طمع شوم برق سامان شد ملخِ کشتزار دهقان شد
از حسد عالمی هجوم انگیخت ژاله گردیدو بر زراعت ریخت
یافت از دست بردِ این اجلاف جیبِ هر دانه صد هزار شگاف
هر کجا حاصلی نشان دادند همچو مورش بخرمن افتادند
هر کجا مزرعی سیاهی کرد حرص افواج برق راهی کرد
کشتها پایمالِ غارت بود سود سرمایهء خسارت بود
حاصل برزگر بصد فریاد گاه می ماند دانه رفته بباد
عجزِ الحاح هیچ سود نداشت آتشِ ناله غیر دود نداشت
دستگاهِ غنا ورق گرداند جز قبولِ خراج چاره نماند
دانه سان گاه دردهان رستند تا بچندین زبان امان جستند
آنچه یک ساله سعیِ دهقان بود مزدِ یکدم تلاشِ ایشان بود
فتوی حرص و غفلت خود کام بر جهانی حلال کرد حرام
هر که برحاصلی فگند نظر شیر مادر شمرد و ارثِ پدر

خرمن آرای عیش گر دیدند　از دلِ جمع خوشه ها چیدند
معده پر گشت و کیسه پیرا شد　کیسه بالیدومخزن آراشد
ایندم انداز فتنه جوشیها　گشت گرمِ شرر فرد شیها
آتشی کا بروی دهقان سوخت　چشم بر رخت شعله کاران دوخت
رشک هم دامن خیال گرفت　ملکِ دل فکرِ جمع مال گرفت
سر زد از شعله کاریِ تدبیر　ریشهٔ موج خنجر و شمشیر
هر طرف لشکری غبار انگیخت　خاکِ تسخیر بر سر هم بیخت
هر کجا اتفاق سامان چید　آفتِ کم بضاعتان گردید
آنکه بردیگری شکست آورد　حاصلِ غیر هم بدست آورد
کرد طوفان ز ساز یکدیگر　شور هنگامهٔ شکست و ظفر
نسقِ گیر و دارمحکم شد　مایهٔ خود سری فراهم شد
بر دهاقین دری که گشت فراز　کرد اقبال بر سلاطین باز
دستگاهِ غرورِ سلطانی　سر زد آخر ز عجز دهقانی
جوش فرعون و شوخیِ نمرود　هر طرف بالِ اقتدار گشود
غفلت این جا چه دست و پا که نکرد　حاصل سیم و زرچها که نکرد
رائگان بود سازِ جاه و حشم　مفت شد دعوی خدائی هم
چون بسا مان شد انتظامِ فساد　چشم بر اصل اعتبار افتاد
خواست تا پایهٔ بنای غرور　نپندیرد خلل بحکم قصور
حرص جو شیدو عدل شد نامش　بست سعی حراست احرا مش
که بدهقان کسی ستم نکند　یعنی از مال شاه کم نکند

تا بجائی رسید سعیِ غرور کز مزارع نماند جز مز دور
با همه دست حاصل آرائی خاک شد ریشهء توانائی
این زمان جز غبار شان صله نیست دست رنجی بغیر آبله نیست
پای تدبیر بر سرِ خرمن لیک یک سر چو گاوِ بسته دهن
جراتی کو که سرفراز کنند؟ یا سوی دانه چشم باز کنند
گر هوس نام آرزو گیرد دانه چون خوشه شان گلو گیرد
برگ کا هی اگر بجیب نهند خوشه ئی سر بداس تیغ دهند
این سزای کسی که کارکند گنج بر خلق آشکار کند
غیر ساغر بموج میگیرد صاحبِ چشمه تشنه می میرد
صورت عدل خسروان این است ظلم در عالم عرض دین است
چون طمع تیغ برکشد ز غلاف نیست آنجا شهید جز انصاف
هر کجا حرص آتشی افروخت جای هیزم همان مروت سوخت
همه ظلم است عدل و احسان کو؟ خودپرستی است نفس ایمان کو ؟
برق در رنگ ابر می بارد شعله رنگینیِ چمن دارد

مثنوی عرفان ہی میں ایک بادشاہ کا ذکر فرماتے ہیں جو دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور پھر اس کی قید سے فرار ہو کر کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور وہاں کے بادشاہ کا مصاحب خاص بن گیا۔ اتفاق سے ایک روز جنگل میں شکار کو گئے تو وہ اور بادشاہ اکیلے رہ گئے، دونوں پیاس کی شدت سے مرنے لگے۔ یہ معزول بادشاہ پانی کی تلاش میں نکلتا ہے پانی لے کر آتا ہے بادشاہ وقت کو پانی دیتا ہے۔ بادشاہ جو قریب مرگ تھا پانی پی کر زندگی کا سانس لیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کیسے ملا؟ یہ معزول بادشاہ بتاتا ہے کہ میں جنگل میں

جا رہا تھا کہ ایک بندر نے پانی تک میری رہنمائی کی، جب کنویں پر پہنچا تو پانی تو مل گیا لیکن رسی اور ڈول نہیں تھا چنانچہ میں نے بندر کو تیر سے مار کر اس کی کھال کا ڈول بنایا اور آپ کے لیے پانی لایا۔ وہ بادشاہ تاڑ گیا کہ یہ عام انسان نہیں ہو سکتا یہ تو صرف بادشاہ ہی کر سکتا ہے، جو اپنے مفاد کے لیے اپنے محسنوں کو مار ڈالتا ہے:

عملی کز تو یافت رنگ ظہور
می دھد بوبی از شھان غیور
یعنی ایں جرات از عوام خطاست
غیر شاھان ز کس نیاید راست
در غرض گرچہ خلق مجنو نند
لیک شاہان ز خلق بیرو نند
عزم شہ گر بفکر قربانی است
خون عالم بریزش ارزانی است
شاہ چو خواہد آتش افروزد
گرھمہ تخت اوست می سوزد

بادشاہ یہ کہہ کر اسے تخت و تاج سونپ دیتا ہے:

تو ھمہ گلی و گر خاری
بی گمان ملک را سزا واری

اس کے ساتھ ہی مزید وضاحت کے لئے میرزا بیدل نے ایک موسیقار اور ایک رقاصہ کنیز کا قصہء عشق بیان کیا ہے جس میں بادشاہ ذرا سی بات پر موسیقار کو کڑی سزا دیتا ہے۔ اس قصہ کے ضمن میں بادشاہوں پر سخت تنقید کی ہے، فرماتے ہیں یہ بادشاہ تو جاہ و مرتبہ

کے دیوانے ہیں ۔ ہوس جاہ میں ہوا میں ٹوپیاں اچھالتے ہیں۔ چراغ کی طرح پوچ خیالات کی وجہ سے انجام کے داغ سے بے خبر ہیں، بے انتہا بے شرم ہیں۔ حیا تو ان کے پاس سے بھی نہیں گزری۔ ان کے سروں میں مغز ہی نہیں کہ کبھی سوچیں یا شرافت وانسانیت اختیار کریں۔ کب تک تم لوگ (بادشاہوں سے خطاب) شان وشوکت کے لیے دردسری مول لو گے۔ طبل وعلم کے خیال سے بھی شرم کرو۔ نقارے اور ڈھول کا یہ تمام شور وغوغا بس ایک ہوا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ تم (نقارے اور ڈھول کی) دماغ چاٹنے والی ہوا سے کمزوروں پر برتری حاصل کرتے ہو اس باعث شرم شان وشوکت سے کچھ تو شرم کرو۔ ایک دنیا (یعنی دنیا کے تمام بادشاہ) اقتدار کے گھمنڈ میں موٹی اون سے مونچھوں کو تاؤ دے رہی ہے، بادشاہ کے علَم وحشم تباہ وبرباد ہوں۔ بادشاہ مغرور اور فقیر میں فرق صرف خفت وتمکین کا ہے۔ بادشاہوں کا تمام سرمایہ سرِ پر غرور ہے جو درویش کے وقار وتمکنت کے سامنے ہیچ ہے۔ عافیت جو ایک سرمایہ ہے وہ دراصل دولت پائیدار درویشی ہے، وہ مغرورِ جاہ جو درویشوں کی دل آزاری کرتا ہے وہ فرعون کی طرح ہے جو موسیٰ سے غافل ہے۔ بادشاہ کو اگر اپنے لشکر پر ناز ہے تو درویش کے انکسار کی گرد اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتی ۔ درویشوں کا ذہن جذبات انتقام سے آزاد ہوتا ہے، ورنہ بادشاہ اپنی سپاہ کی مدد سے جو فتح حاصل کرتا ہے وہ درویش اپنی آہ سے پالیتا ہے۔ یاد رکھو جہاں ہمت کمر بستہ ہو جائے چیونٹی شیر پر غالب آجاتی ہے:

کاین جنون فطرتان غرہ جاہ ‏ ‏ ‏ ‏ از ہوس بر ہوا فگندہ کلاہ
ہمچو شمع از دماغ پوچ خیال ‏ ‏ ‏ ‏ آگہی نیست شان زداغ مآل
بسکہ بیبا کی نمو دارند ‏ ‏ ‏ ‏ بحیا سر فرو نمی آرند
این نمو غیر بے حیائی نیست ‏ ‏ ‏ ‏ جوہرِ عبرت آشنائی نیست

مغز کو تا سری فرود آرند　　پیشِ اقبالِ دل سجود آرند
چیست اقبال پیش بین بودن　　آسمان داشتن زمین بودن
چند دردِ سر و دماغ حشم　　شرم دار از خیال طبل و علم
نتوان یافت با همه غوغا　　مغزِ کوس و دھل بغیر ہوا
سهل دان خود فروشی غلغل　　بادو پشم است درکلاه دهل
حیف باشد ز مغز خورده هوا　　بر ضعیفان بلند چید نها
با چنین جاه انفعال آثار　　اند کی پاس شرم همت دار
عالمی در تخیلِ جبروت　　دارد از پشم گنده باد بروت
در گدا وشهِ غرور آئین　　فرقی افگنده خفت و تمکین
عالمِ جاه غیر تلوین نیست　　کروفر از جهانِ تمکین نیست
بیوقار است مست جام غرور　　نشه عجز ایمن است از شور
دستگاه شهان سر بهوا　　نیست هم کفهٔ وقار گدا
آنچه سامان عافیت کیشی است　　دولت پایدارِ درویشی است
مست جاهی که در شکستِ گداست　　همچو فرعون غافل از موسی است
شورش نیل نیست در نظرش　　کز غرور حشم دهد خبرش
یک مژه گر گدا بیفشارد　　شور چندین دهل نم انبارد
همچو اصحاب فیل غفلتِ شاه　　از مکافات اگر نشد آگاه
چون بسر در رسد ابابیلش　　نیست جز خاک بر سر فیلش
شاه اگر ناز بر حشم دارد　　گرد عجز گدا چه غم دارد
ما گدا یان منزه از هو سیم　　مغتنم فهم راحت نفسیم

بے دماغ است کوششِ درویش | کہ تلافی کس ندراد پیش
ورنہ شاہ آنچہ وا کند بہ سپاہ | میکشا ید گدا بجیشِ آہ
گر شھانرا غرور بار گھی است | عاجز انرا شکستِ دل کلھی است
ہمت آنجا کہ بستہ است کمر | مور بر شیر بردہ است ظفر

میرزا بیدل نہ صرف بادشاہوں کو بلکہ اہل دولت وثروت کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ مثنوی عرفان میں ایک جگہ میکشی کی مذمت کرتے ہیں تو ساتھ ہی می نوش اہل اقتدار اور اہل دولت کو بھی نشانہء تنقید بناتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ می نوشی دراصل ستمگری ہے۔ انسانیت سے عاری ہونے کا نام ہے، جسے انہوں نے اپنے خاص شاعرانہ انداز میں یوں کہا ہے کہ ے نوشی دل کے جام کے خط کو قلم زن کرنا ہے۔ شراب نوشی انسان کو ادب و تہذیب سے بیگانہ کر دیتی ہے بالخصوص اگر شراب نوش صاحب اقتدار ہو۔ یعنی غریب شراب پئے گا تو خود کو برباد کرے گا لیکن حاکم شراب پئے گا تو ملک کو تباہ کردے گا۔

یہ شرابِ فتنہ سامان اہل دولت کا دماغ خراب کر دیتی ہے ورنہ غریب انسان سے تو کسی پر ظلم وستم ہوتا نہیں۔ غریب و مفلس سوائے اظہار عجز وانکسار کے کر بھی کیا سکتا ہے۔ ظلم تو صرف اہل اقتدار ہی کرتے ہیں کہ ایک دنیا ان کے ظلم وستم سے خون کے سے گھونٹ پیتی ہے۔ ظلم تو صرف قوت واقتدار ہی سے سرزد ہوسکتا ہے۔ غریب تو صرف آہ ہی کر سکتا ہے۔ اے اہل اقتدار تم بہت سخت دل ہو وگرنہ درحقیقت ہم تو ایک کُل کے جزو ہیں اور کُل یعنی باری تعالی تمام تر ہوش ودانش وحکمت ہے۔ ہماری طرح پنبہ در گوش نہیں یعنی خدا سب کی سنتا ہے، دل کی فریاد آندھی کا غبار نہیں ہے اگر تم فریاد نہیں سنتے تو آسمان تو بہرا نہیں ہے۔ یعنی خدا تو سنتا ہے، یاد رکھو ایک چیونٹی کا دل بھی اگر دکھتا ہے تو اس کی آہ آسمان کو ڈھا دیتی ہے یعنی تہ وبالا کر دیتی ہے۔ تو دوستوں کی بات سنتا ہی نہیں ورنہ ہر دل میں تیری

ہی صدا ہے، تو دلوں کی فریاد اس لیے نہیں سنتا کہ تو نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے۔ تو ہر شخص کے ساتھ ظلم سے پیش آتا ہے۔ اس سے زیادہ ظلم تو کیا کرے گا کہ تو نے دلوں کو توڑا ہے۔ تیرا جرم یہ ہے کہ تو دلوں کو بھی شیشہ سمجھتا ہے۔ افسوس کہ تو دل کی حقیقت نہیں سمجھا' خدا کے حکم سے سرتابی مت کر یہ دنیا وہم وخیال ہے، دلوں کی یعنی انسانوں کی قدر کر اور انسانیت سیکھ:

ای ز فریاد بید لان غافل قلقل اندیشۂ شکستنِ دل
این چہ مستیست کز تو می بالد وین چہ ساز است کز تو می نالد
بامی و جام کر دی آنھمہ میل کہ بنای شعور رفت بہ سیل
میکشی ساغر ستم زدن است بر خط جام دل قلم زدن است
طبع می نیست از ادب آگاہ خاصہ آن می کہ جو شد از خمِ جاہ
بیشتر این شرابِ فتنہ عمل میزند بر دماغ اہلِ دول
از فقیران بکس ستم نرسید گردن عجز جز بخم نرسید
زاہل جاہ این جنون برون زدہ است کہ جہان جامِ دل بخون زدہ است
ظلم بے دستگاہ گل نکند در ضعیفی جز آہ گل نکند
محرمانِ حضورِ این محفل بسکہ دارند پاسِ نسبتِ دل
ادبی تا بدل نگاشتہ اند پنبہ از شیشہ برنداشتہ اند
مستیت از شکستِ دل پیداست کہ ازین شیشہ ہیچ عذر نخواست
جزوِ کلیم و کل ھمہ ھوش است نہ چوما دنگ و پنبہ در گوش است
غافل از جز و ہیچ کل نشود شیشہ مشکن کہ سنگِ مل نشود
نالۂ دل غبارِ صر صر نیست گر تو نشنیدی آسمان کر نیست

دل اگر نقدِ جن و گرانس است — در برت نیز از همان جنس است
هر کرا قدر دانِ دل کردند — خاکش از آب شرم گل کردند
گرچه دور از هم اند یا نزدیک — با غم و شادیِ هم اند شریک
دل موری اگر به درد آید — بافلک غالب نبرد آید
گوشت آواز آشنا نشود — ورنه در هر دلی صدای تو بود
باید از سازِ دل حیا کردن — فهم آوازِ آشنا کردن
اینهمه جرم پنبهء گوش است — که خردش دلت فراموش است
پنبه از گوش شیشه تا نرود — قلقل خویش هم نمی شنود
پس بهر کس به ظلم پیش آئی — تشنهء انتقام خویش آئی
پیش از آن کت فلک کند آگاه — بر نداری ز .گو شمال نگاه
این هوس نغمه های بیدردی — مشنو آ نقدر که کر گردی
ظلم ازین بیشتر چه خواهی کرد — دل شکستی دگرچه خواهی کرد
دل شکستی و ناله نشنیدی — از خود ای بے خبر چه فهمیدی
در بساطی که شورِ مظلوم است — پنبه در گوش داشتن شوم است
شیشه ما دیده ای خطا این است — دل نه فهمیده ئی بلا این است
شرم دار از جناب یکتائی — که یکی و دو در خیال آئی
لیلی ئی نیست محمل است اینجا — تا ابد کار با دل است اینجا
سر تسلیم ازین جناب متاب — دهر وهم است قدرِ دل دریاب

ایک اور جگہ میرزا بیدل کہتے ہیں کہ دولت مند کبھی آ گہی حاصل نہیں کر سکتا بھلا کہیں مخمل بھی خواب سے بیدار ہوتا ہے یعنی دولت مند تو کبھی انسانیت سیکھ ہی نہیں سکتے:

منعم و آگہی چہ امکان است
محمل از خواب کی شود بیدار

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کے اے دولت مندو کب تک دولت کو زمین میں چھپاؤ گے یعنی دولت خرچ نہیں کرتے بلکہ جمع کرتے ہو افسوس ہے کے تم قارون کی روش پر چل رہے ہو:

منعمان تا چند باید زر بزیرِ خاک برد
حیف ہمتہا کہ صرف خدمت قارون کنید

میرزا بیدل نے اپنے عہد پر بھی شدید تنقید کی ہے۔ اس تنقید کا بنیادی نشانہ بھی ایک لحاظ سے بادشاہان وقت کی شخصیت ہی تھی۔ اگر چہ میرزا بیدل کو حضرت عالمگیر سے بے پناہ عقیدت تھی اور میرزا بیدل حضرت عالمگیر کی اسلامی خدمات کی بنا پر انہیں شاہ دین پناہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت عالمگیر تسخیر دکن میں مصروف تھے اور دہلی اور نواح دہلی میں بدامنی کا دور دورہ تھا تو میرزا نے چہار عنصر میں یوں تنقید کی۔

''بادشاہ عالمگیر بخیال تسخیر دکن پرداختہ بود و برق بی کسی بر سواد ہند تاختہ'' دادگری غیراز بیدادِ کفار متصور نبود صورت فریاد جز آیینہ ٴ گوشہای کرنمی زدود''

اس بدنظمی کی کیفیت کو کچھ طنز و مزاح کی چاشنی میں ملا کر اپنے خاص رنگ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ''اگر واعظ کا عمامہ گم ہو جاتا تھا تو گنبدِ افلاک سے پرے سراغ مل سکتا تھا اور اگر زاہد کا عصا گم ہو جاتا تھا تو سوائے شاخ سدرہ و طوبی کے کہیں اس کا نشان نہیں ملتا تھا'' دران ہنگامہ اگر واعظ عمامہ گم میکرد بیرون گنبد افلاک سراغ می آمد و اگر زاہد عصا از دست می انداخت، جز در شاخ سدرہ و طوبی، نشانش نمی شناخت''

میرزا بیدل شکر اللہ خان کو جو مغلیہ دربار کے ایک بہت بڑے امیر تھے اعظم شاہ

اور بیدار بخت کے عبرت ناک قتل کا ذکر کر کے دعوت عبرت دیتے ہیں:

بوہم دولت بیدار خوابہا دیدند	در آخر اعظم و بیدار بخت خوابیدند

اور

ضبط نفسی رو کش افواہ کنید	دل را دمی از عاقبت آگاہ کنید
افسانہ این آن تسلسل دارد	بر خود پیچید و رشتہ کو تاہ کنید

یعنی شہزادہ اعظم و بیدار بخت دولت و اقتدار کے خواب دیکھ رہے تھے اور آخر ہوا یوں کہ موت کی نیند سو گئے ذرا تم بھی اس سے عبرت پکڑو اور اپنے انجام سے غافل نہ رہو۔

میرزا بیدل کا یہ شعر اپنی تمام دلالتوں کے ساتھ نہ صرف ان کے عہدِ پر آشوب کی تصویر کشی کر رہا ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید آج کے کسی انقلابی شاعر کا شعر ہے:

گر سلامت خواہی از سازِ تظلم دم مزن	دادرس در عہد ماسنگ است مینا دادخواہ

یعنی اگر اپنی جان کی امان چاہتے ہو تو فریاد تو کیا آہ بھی نہ کرنا کہ اس دور میں دادرس پتھر ہے اور دادخواہ (شیشے کی) مینا ہے۔ میرزا کے کلام میں یہ خوبی ہے کے ایک شعر کئی مطالب لیے ہوتا ہے، جو ایک حقیقت کی کئی جہتوں کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً اس شعر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حکامِ وقت ظالم ہیں کہ گویا پتھر ہیں اور عوام مظلوم اور کمزور ہیں کہ گویا شیشے کی صراحی ہیں۔ ظاہر ہے شیشے کی صراحی پتھر سے ٹکرائے گی تو ٹوٹے گی۔ اس لیے حاکموں کے ظلم پر خاموش رہو کیوں اپنی جان گنواتے ہو لیکن ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ عوام کمزور بنے ہوئے ہیں خود کو شیشے کی مینا بنائے ہوئے ہیں اور حکام پتھر ہیں ان کا مقابلہ پتھر بن کر ہی ہو سکتا ہے' مینا بن کر نہیں۔ تم مینا ہو تو خاموش رہو، بالواسطہ یوں کہا کہ کیوں فضول جان کو گنواتے ہو یعنی اپنا حق لینے کے لیے پتھر کے سامنے پتھر بنو۔

اسی طرح ایک شعر میں میرزا کہتے ہیں کہ اگر آج تمام انسان عدل و انصاف کو اپنا

شعار بنالیں تو پھر کوئی شخص بھی دجال اور حضرت مہدی کا منتظر نہ رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اس پر جتنا سوچا جائے اتنا ہی اسے انسانی ذہن تسلیم کرے گا:

امروز اگر انصاف دهد دادِ طبایع　　کس منتظرِ مهدی و دجال نباشد

میرزا بیدل نے ایک جگہ عوام کی ترجمانی اس انداز سے کی ہے کہ گویا عہد حاضر کا کوئی شاعر یہ حق ادا کر رہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ فتنہ جو عوام کے ذہنوں اور دلوں سے ابھرتا ہے وہ آگ اور بجلی سے بھی زیادہ خطرناک اور سوزاں تر ہوتا ہے۔ حکمرانوں کو کمزوروں کے ہجوم سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ یعنی کمزور عوام کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب عوام اٹھ کھڑے ہوں تو بڑے سے بڑے ظالم حکمران بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مسکین چیونٹیاں جب باہم جمع ہو کر حملہ آور ہوتی ہیں تو اژدہا بن جاتی ہیں جب آگ بلند ہو جائے تو سب خشک و تر کو جلا ڈالتی ہے:

الحذر زان فتنه ای کز طبع مردم گل کند
اتفاقِ این غبار از برق هم سوزان تر است
از هجوم عاجزان غافل نباید زیستن
مورِ مسکین هر کجا جوشید باهم اژدر است
امتیازِ نیک و بد محواست در جوشِ عوام
چون بلند افتاد آتش خشک و تر خاکستر است

مآخذ

۱۔ مثنوی عرفان، کلیات بیدل (عرفان، طلسم حیرت، طور معرفت، محیط اعظم) جلد سوم چاپ کابل ۱۳۴۲ھ۔ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، ۱۳۶۷۔

۲۔ امیر علی شیر خان لودھی، مرآۃ الخیال، چاپ بمبئی۔
نیز ر۔ک بھگوان داس ہندی، سفینہ ھندی، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمان ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ بہار، ص ۲۹۔

۳۔ مرزا بیدل، دیوان، چاپ کابل۔

۴۔ بیدل، کلیات (چہار عنصر، رقعات، نکات)، جلد چہارم، چاپ کابل، ۱۳۴۴ھ۔

۵۔ ذبیح اللہ صفا، گنجینۂ سخن، تہران، ۱۳۷۶ھ۔

بیدل اور غالب
میں
فکری و فنی قربتیں اور فاصلے

غالب اردو کے علاوہ فارسی زبان کے بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ خود ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا فارسی کلام "نقشھای رنگ رنگ" پر مشتمل ہے وہ اپنے اردو کلام کو بے رنگ کہتے ہیں جیسا کہ ان کے اس شعر میں ہے:

فارسی بین تا بہ بینی نقشھائے رنگ رنگ
بگذر از سرمایۂ اردو کہ بی رنگِ من است

غالب اپنے فارسی کلام کے بارے میں احساس افتخار رکھتے تھے جبکہ اردو کلام کو وہ وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ___ ان کے ہم عصر بھی انہیں اردو کے مقابلے میں فارسی ہی کا بہت بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ حالی نے مرزا کا بڑا ازوردار مرثیہ لکھا تھا اور اس میں غالب کا مقابلہ فارسی شعراہی سے کیا تھا' قدسی و صائب وغیرہ سے غالب کا مقابلہ کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں:

قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ دان سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت

محمد حسین آزاد نے بھی مرزا کی وفات پر جو تاریخ کہی تھی اس میں غالب کو فارسی کے بڑے بڑے شعرا پر فوقیت دی تھی اور یوں کہا تھا:

عنصری پیش اوست بی جوھر
عسجدی بردہ بردرش سجدہ

(یعنی عنصری جیسا ملک الشعرا غالب کے سامنے ہیچ ہے اور عسجدی تو اس کے در پر سجدہ ریز ہے)

اور خود غالب بھی اپنے فارسی دیوان کو صحیفۂ آسمانی کے برابر اور خود کو فارسی کا عظیم شاعر سمجھتے تھے:

گر ذوقِ سخن بہ دھر آئین بودی
دیوانِ مرا شھرتِ پروین بودی
غالب اگر این فنِ سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

(یعنی اگر اہلِ دنیا صاحب ذوق ہوتے تو میرے دیوان کو پروین ستارے کی طرح شہرت ملتی اور اگر شعر گوئی دین ہوتا تو اس دین کی الہامی کتاب میرا دیوان ہوتا)

؎ غالب بہ شعر کم ز ظھوری نیم ولی
عادل شہ سخن رسِ دریا نوال کو؟

یعنی شاعری میں (فارسی شاعری میں) اے غالب! میں ظہوری (مشہور فارسی شاعر) سے کم نہیں ہوں لیکن آج کے دور میں انصاف کہاں؟

ناظم ھروی نے ایک نظم میں عنصری سے جامی تک فارسی کے سر برآوردہ شعرا کے نام گنوائے ہیں اور جامی پر فارسی شاعری کو تمام کر دیا تھا:

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
ز جامی سخن را تمامی رسید

(یعنی امیر خسرو سے جامی تک جب شاعری کی نوبت پہنچی تو فارسی شاعری جامی پر ختم ہوگئی)

غالب نے اس فہرست میں اپنا نام یوں شامل کر دیا:

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

(یعنی جامی سے شاعری عرفی و طالب تک پہنچی اور پھر غالب تک آئی)

غالب نے خود کو عندلیبِ گلستانِ عجم کہا ہے:

بود غالب عندلیبی از گلستانِ عجم
من ز غفلت طوطیِ ہندوستان نامیدمش (کلیات غالب ص ۲۳۸)

غالب ایسا عظیم شاعر بیدل عظیم آبادی (وفات ۱۱۳۳ھ) کے کلام کی عظمت کا معترف ہے ___ بیدل فارسی زبان کے مسلم الثبوت استاد تھے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں اور نقادانِ سخن نے بحیثیت شاعرِ فارسی ان کے فکر و فن کی عظمتوں کو تسلیم کیا ہے اور انہیں استادِ فنِ شعر مانا ہے ___ محمد افضل سرخوش نے ''کلمات الشعرا'' میں بیدل کو استاد فن اور آزاد بلگرامی نے ''خزانۂ عامرہ'' میں بیدل کو ''پیرِ میکدۂ سخن دانی و افلاطونِ خُم نشینِ یونانِ معانی'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ (خزانہ عامرہ ص ۱۵۲) میر عبدالرزاق خوافی نے بیدل کے شعری مقام کو بڑے پُر شکوہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

''بر سریرِ سخن گستری فرِ دارائی و شکوہِ جمشیدی داشتہ''

یعنی بیدل شاعری کے تخت (شاہی) پر جمشید و دارا کی سی شان و شکوہ رکھتے تھے۔

(صفا، تاریخ ادبیات در ایران، جلد پنجم، ص ۱۳۷۸)

علامہ اقبال، مجنون گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالغنی اور دوسرے مفکرین اور نقادانِ سخن نے اپنی نگارشات میں مرزا بیدل کو ایک عظیم شاعر اور مفکر مانا ہے، خود مرزا غالب نے بھی اپنے بہت سے اشعار میں مرزا بیدل کے فکروفن اور ان کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مرزا بیدل تخیل بلند، فکر عمیق، تناسبِ الفاظ اور تقابلِ معانی سے اشعار کا جو طلسم خانہ تخلیق کرتے ہیں وہ بظاہر طاؤسِ سخن کی تمثیل اور بہ معنی عنقائے فکر کی تمثال ہوتا ہے۔ صاحب خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی نے مندرجہ ذیل شعر میں بیدل کے کلام پر بہت خوبصورت اور صحیح تبصرہ کیا ہے:

رساند پایۂ معنی بہ آسمانِ نہم

بلند طبع شناسد کلامِ بیدل را (خزانۂ عامرہ، ص ۱۵۲)

یعنی بیدل نے معانی کا مرتبہ نویں آسمان تک پہنچا دیا صرف بلند طبع شخص ہی بیدل کے کلام کی معنوی بلندی کو پا سکتا ہے۔

البتہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران میں بیدل کے کلام پر تنقید کی ہے اور بطور مثال ان کے مندرجہ ذیل شعر کو بے معنی خیال کیا ہے:

نزاکت ھاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت

مُژہ برھم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور خاص طور پر یہ کہا ہے کہ:

رنگ تماشا چگونہ رنگ است و آن را چگونہ می شکنند؟'' یعنی رنگ تماشا کیسا رنگ ہے اور اسے کیسے توڑتے یا ختم کرتے ہیں۔ (ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، جلد پنجم ص ۴۳۹)

حالانکہ بیدل کا یہ شعر بہت بلند معانی کا حامل ہے۔اس شعر کا اردو میں ترجمہ تو یوں ہے کہ (جلوہ ہائے محبوب کے) میناخانۂ حیرت کی آغوش میں نزاکتیں ہی نزاکتیں ہیں، پلک بھی مت جھپکئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رنگ تماشا ٹوٹ جائے اور سارا منظر درہم برہم ہو جائے۔یہاں رنگ کے معانی رونق کے ہیں جیسا کہ فردوسی نے بھی اس شعر میں رنگ کے یہی معانی لیے ہیں:

بخانہ درآی ار جہان تنگ شد
ہمہ کار بی برگ وبی رنگ شد

ویسے بھی لفظِ رنگ کے معانی علاوہ کسی چیز کی ظاہری صورت جیسے سبز وسرخ صورت کے اور بھی ہیں، رنگ کے معانی رونق، رواج، فائدہ، حصہ، مکر وحیلہ اور فریب بھی ہیں۔(بحوالہ فرہنگ عمید) بیدل کے شعر میں مژہ برہم مزن یا ''پلک مت جھپکئے'' سے مراد ہے غفلت یا بے توجہی سے بچئے یعنی محبوب کے حضور ہمہ تن متوجہ رہنا چاہیے کیونکہ اس کی بارگاہ میں غفلت بہت بڑا جرم ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ بارگاہ حسن میں جہاں حیرت انگیز جلووں کا میناخانہ ہے وہاں عاشق کو تمامتر جلوہ ہائے محبوب کی جانب متوجہ اور اس کے دیدار میں محو رہنا چاہئے کیونکہ اگر ذراسی بھی غفلت برتی گئی تو محبوب جو بہت ہی نازک طبع ہے اس کا مزاج برہم ہو جائے گا اور اس نظارۂ جمال کا رنگ جاتا رہے گا یعنی یہ منظر حسن ختم ہو جائے گا۔اس شعر میں مناسباتِ بھی ہیں جنھوں نے اس شعر کو دلکش اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے' میناخانہ کی نسبت سے نزاکت' حیرت اور آغوش کے الفاظ شعر کی معنویت کو اجاگر کر رہے ہیں' تماشا کی نسبت سے لفظ مژہ لایا گیا ہے لیکن ان مناسبات لفظی میں تکلف نہیں بلکہ یہ مناسبات لفظی تو ابلاغ کامل کی ضرورت ہیں۔ ''میناخانۂ حیرت'' مختلف معانی کی دلالتیں لئے ہوئے ہے۔ یہ ''میناخانۂ حیرت''، محبوبِ مجازی کی جلوہ گاہ بھی ہو سکتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی بارگاہ بھی' میخانہ

بھی اور مسجد بھی، حضورِ حسن بھی اور حضورِ حق بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ جہانِ رنگ و بو، یہ دنیائے معاملات بھی تو مینا خانۂ حیرت ہے جہاں انسان کو ہر قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں ذراسی غفلت سے کسی کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ لگ جائے' یہ آبگینے تو اتنے نازک ہیں کہ صرف ایک پلک کے جھپکنے سے ٹوٹ سکتے ہیں یا یوں کہیے کہ انسان کی توجہ میں ذراسی کمی سے کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ سو اس شعر کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ نازک مزاج محبوب اپنے حضور میں ذراسی غفلت یا بے توجہی کو برداشت نہیں کرتا اور فوراً اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور سارا بنا بنایا منظر یا تماشا بکھر جاتا ہے اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم غفلتِ نظر سے دور رہیں' نیز معاشرتی مسائل کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنا بھی اس شعر کے مفہوم کا ایک پہلو ہے اور صوفیہ کے مسلک میں مقام حضوری میں خواطر (خیالات) پر بھی پوری طرح نظر رکھنی پڑتی ہے' یہ مفہوم بھی اس شعر میں موجود ہے۔ میر نے اردو میں کہا تھا:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

بیدل کا یہ شعر میر کے شعر کا مفہوم بھی لئے ہوئے ہے۔

بیدل کے اشعار میں افکار کی رعنائی، معانی کی رنگارنگی' اور رمزیت کی گہرائی عام ہے اور خاص طور پر رمزیت کا انداز بیدل کے اشعار میں جو بظاہر مبہم نظر آتے ہیں اس لئے ہے کہ وہ اپنے احساس یا فکر کے مختلف دقیق پہلوؤں کو ایک شعر کی تنگنائے میں پیش کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی کامل تصویر سامنے آجائے' یہ بیدل کا کمالِ فن ہے' ابلاغِ کامل ہے یہ تعقیدِ معنوی یا شعر کا معنوی عیب نہیں۔

مرزا غالب نے شاعری میں مرزا بیدل کو اپنا استادِ معنوی مانا ہے اور ''ریختہ'' میں

یعنی اردو شعر گوئی میں طرزِ بیدل کی پیروی کرنے کی کوشش بھی کی ہے، اگر چہ طرزِ بیدل کی پیروی کے سلسلہ میں خود مرزا بیدل کا دعویٰ تو یہ ہے کہ طرزِ بیدل کی پیروی نہیں کی جا سکتی، بھلا جادو بھی کہیں معجزے کی برابری کر سکتا ہے؟:

مدعی درگذر از دعویٰ طرزِ بیدل
سحر مشکل کہ بہ کیفیتِ اعجاز رسد

یہی وجہ ہے کہ غالب نے اردو میں جو اشعار طرزِ بیدل میں کہے ہیں وہ اس قسم کے ہیں:

عرضِ نازِ شوخیِ دندان برائے خندہ ہے
دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ایسے اشعار کے متعلق مرزا غالب کے ہمعصر اُن پر تنقید کرتے تھے جیسا کہ حکیم آغا خان عیش نے برسرِ مجلس مرزا غالب کو مخاطب کر کے کہا تھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب کو بالآخر خود بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ بیدل کی تقلید یا طرزِ بیدل میں شعر کہنا بہت مشکل ہے، اس لیے غالب کو کہنا پڑا:

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خان قیامت ہے

بیدل کا ایک اسلوب شعر گوئی ہے ان کے کلام میں ایک مخصوص آہنگ ہے یا یوں کہیے کہ ان کے کلام میں ایک نغمگی کی فضا ہے، جو تخیل، فکر، جذبے، رمزیت، صوفیانہ وجدان

اور خوبصورت تراکیب کی ہم آہنگی سے وجود میں آتی ہے اور شعر کو معجزہ فن بنا دیتی ہے۔

غالب کے کلام میں جو ایک نغمگی سی کیفیت ہے وہ بیدل کے طرز ہی کی عکاس ہے، غالب کا یہ شعر:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اسی نغمگی یا دلکش آہنگ کا حامل ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ شعر میں بے حد ابہام ہے پھر بھی یہ شعر پڑھنے والا بغیر مطلب سمجھے ہی اس کے دلکش آہنگ سے لطف اندوز ہوتا ہے، خود علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں فلک مشتری پر غالب سے ملاقات کے دوران ان کے اس مذکورہ شعر کے معنی پوچھے تھے، غالب نے بتائے بھی پھر بھی بات نہ بنی اور علامہ کو یہی کہتے بنی:

من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز (کلیات اقبال ۷۱۴-۷۱۲)

یوں غالب بیدل کی طرز کو کلی طور پر نہ اپنا سکے پھر بھی فکر و فن کے حوالے سے غالب نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں میرزا بیدل کا بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ بیدل نے کہا تھا:

زندگی گر عشرتی دارد امیدِ مردن است

اور غالب نے کہا تھا:

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بیدل نے کہا تھا:

منزلِ عیش تو وحشت کدۂ امکان نیست

چمن از سایۂ گل پشت پلنگِ است اینجا

(تیری منزل عیش یہ دنیا، جو وحشت کدۂ امکان ہے، نہیں ہے، یہاں تو چمن بھی

سایۂ گل سے چیتے کی پیٹھ بنا ہوا ہے (چیتا خطرناک جانور ہوتا ہے))

غالب اردو میں کہتے ہیں:

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ھوا داغ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

بیدل نے کہا تھا:

دل آسودۂ ما شور امکان در نفس دارد
گہر دزدیدہ است اینجا عنانِ ضبطِ دریا را

(ہمارا آسودہ دل ہر سانس میں امکان کا شور رکھتا ہے (گویا) موتی نے ضبط دریا کی باگ چرالی ہے یعنی سب کچھ عارضی ہے، وقتی ہے، سانس سے زندگی ہے اور سانس گویا شور امکان ہے کہ سانس چلتا رہے گا تو زندگی قائم رہے گی)

غالب اردو میں کہتے ہیں:

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل نے کہا تھا:

دیدہ ای را کہ بہ نظارۂ دل محرم نیست
مُژہ برهم زدن از دست ندامت کم نیست

(وہ آنکھ جو نظارۂ دل کی محرم نہیں ہے اس کا پلک جھپکانا گویا شرم سے ہاتھ مارنا ہے یعنی اپنی ناکامی پر شرمندہ ہونا ہے)

اردو میں غالب کہتے ہیں:

ز بسکہ عشق تماشا، جنون علامت ہے
کشاد و بستِ مُژہ، سیلیِ ندامت ہے

بیدل نے کہا تھا:

ہیچ پرواز ز خاکسترِ خود بالا نیست
بیدل این ھفت فلک بیضۂ یک فاختہ است

(کوئی پرواز اپنی مٹی سے بلند تر نہیں، بیدل یہ سات آسمان ایک فاختہ کے انڈے کی طرح ہیں)

اردو میں غالب کہتے ہیں:

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بیدل نے کہا تھا:

چشم وا کردن کفیلِ فرصتِ نظارہ نیست
پرتوِ این شمع آغوشِ وداعِ محفل است

یعنی آنکھ کو کھولنا نظارہ کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتا، بلکہ یہ تو محفل کو الوداع کہنے کی ایک صورت ہے۔

اردو میں غالب کہتے ہیں:

تا کجا ای آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

بیدل نے کہا تھا:

تا کی ز خلق پردہ بہ رو افگنی چو خضر
مردن بہ از خجالتِ بسیار زیستن

(کب تک مخلوق خدا سے چھپنے کے لیے خضر کی طرح منہ پر نقاب ڈالو گے یعنی

خلق خدا سے چھپتے پھرو گے، خجالت کے ساتھ لمبی زندگی سے تو مرنا بہتر ہے)

اردو میں غالب کہتے ہیں:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

بیدل نے کہا تھا:

روشن دلان چو آئینہ بر ھر چہ رو کنند
ھم در طلسمِ خویش تماشای او کنند

(یعنی روشن دل لوگ آئینہ کی طرح جس طرف بھی منہ کرتے ہیں اپنی ذات کے طلسم ہی میں اس کی یعنی خدا کی تجلیات دیکھتے ہیں)

غالب کہتے ہیں:

از بس بشوقِ روی تو مست است نو بھار
بوی می آید ار دھنِ غنچہ بو کنند

(تیرے چہرے کے دیدار کے شوق میں بہار یوں مست ہے کہ غنچہ کے منہ کو سونگھیں تو خوشبو آئے)

تحقیق و جستجو اور حقائق اشیا کے جاننے کی لگن دونوں شاعروں میں مشترک ہے، بیدل نے کہا تھا:

حیرتی رو داد دل اندیشۂ آیینہ کرد
عقدہ ای در رشتہ ظاھر گشت و گوھر ریختند
یاسِ مطلب آتشی افروخت دوزخ برق زد
شوخیِ جھدی عرق آورد و کوثر ریختند

(حیرت ظاہر ہوئی تو دل میں آئینہ کا خیال آیا' دھاگے میں گرہ رونما ہوئی تو موتی بنایا گیا۔ مقصد میں ناکامی نے ایک آگ جلائی جس سے دوزخ بھڑک اٹھی' جدوجہد کی شوخی کو پسینہ آیا تو حوض کوثر بنادی گئی)

غالب کہتے ہیں:

قطرۂ خونی گرہ گر دید دل دانستمش
موج زھرابی بطوفان زد زبان نامیدمش
وھم خاکی ریخت در چشمم بیابان دیدمش
قطرۂ بگداخت بحر بیکران نامیدمش

(خون کا قطرہ گرہ بن گیا میں نے اسے دل سمجھا' زہراب کی موج طوفان میں آئی تو اسے زبان کا نام دیا گیا' وہم نے میری آنکھ میں خاک جھونکی میں نے اسے بیابان کے طور پر دیکھا' قطرہ پگھلا تو اس کا نام میں نے بحرِ بیکراں رکھ دیا)

بیدل نے کہا تھا:

نیست نقش پا بہ گلزار خرامت جلوہ گر
دفتر برگ گل از دست بھار افتادہ است

(تیرے خراماں خراماں چلنے سے چمن میں تیرے پاؤں کا نقش جلوہ گر نہیں ہوا بلکہ پھولوں کی پتیوں سے بھری سینی بہار کے ہاتھ سے گر گئی ہے)

غالب اردو میں کہتے ہیں:

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقش پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

بیدل ایک صوفی صاف دل اور ایک صاحب حال شاعر تھے جبکہ غالب اس

کوچے سے نابلد تھے، اس لیے غالب کی نظر میں وہ بلندی اور فکر میں وہ دردمندی نہیں، جو بیدل کے فکر ونظر میں ہے اور جس کا اظہار بیدل کے کلام میں عام ہے۔ غالب نے تو یہ اشعار عرفی کے جواب میں روایتی طور پر کہے تھے:

بی تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا است
قعرِ دریا سلسبیل و روی دریا آتش است
گشتہ ام غالب طرف با مشربِ عرفی کہ گفت
روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

(مصیبت کے خوف کے ساتھ جینے سے مصیبت میں بلا تکلف جینا بہتر ہے، سمندر کی گہرائی (سمندر میں ڈوبنا) سلسبیل کی طرح خوش آئند ہے اور سمندر کی اوپر والی سطح (سمندر کی سطح پر تیرنا) آگ کی طرح خوفناک ہے، میں نے غالب یہ بات عرفی کے مشرب کے برخلاف کہی ہے کہ اس نے کہا تھا کہ سمندر کی اوپر کی سطح سلسبیل ہے (بے خطر ہے) اور سمندر کی گہرائی آگ کی طرح خطرناک ہے)

بیدل صوفی تھے اور دریائے معرفت کے غواص تھے، مندرجہ ذیل شعر ان کی اسی تصوف مشربی کی عکاسی کرتا ہے، ان کے دل کی آواز بھی ہے اور حقیقت کے قریب بھی:

غرق وحدت باش اگر آسودہ خواھی زیستن
ماھیان را ھر چہ باشد غیر دریا آتش است

(یعنی وحدت کے سمندر میں ڈوب جاؤ اگر زندگی میں آسودگی چاہتے ہو، کیونکہ مچھلیوں کے لیے سمندر کے علاوہ جو کچھ بھی دنیا میں ہے آگ کی طرح خطرناک ہے)

غالب نے اپنے شعر کا یہ مضمون:

بی تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا است

بیدل کے مندرجہ ذیل شعروں سے غالباً لیا ہوگا:

حوادث عین آسایش بود آزادہ مشرب را
کہ موجِ بحر دارد از شکست خویش جوھر ھا

(ایک آزاد مشرب کے لیے حادثے تمامتر آسایش ہوتے ہیں کہ سمندر کی موج اپنے ٹوٹنے ہی سے موتی رکھتی ہے)

امیدِ سلامت بجز آفات ندارد
کشتی شکن و ایمن از امواجِ خطر شو

(زندگی میں سلامتی کی امید سوائے آفات و مصائب کے کہیں نہیں ہے، کشتی توڑ دیجیے اور پر خطر موجوں سے محفوظ ہو جائیے)

بیدل کی زمین میں غالب نے فارسی میں بہت سی غزلیں کہی ہیں اور اپنے رنگ میں خوب کہی ہیں، فکر و فن کے سلسلے میں بیدل اور غالب میں چند قدریں مشترک بھی ہیں۔ غالب کے کلام میں معنی آفرینی اور حقایق حیات کے بارے میں سوالیہ انداز بیان اور فکر عمیق کا جو عنصر موجود ہے بہت حد تک بیدل کے زیر اثر ہی آیا ہے، غالب کے ہاں تشبیہ اور استعارہ کا خوبصورت استعمال اور تراکیب تراشی بھی بیدل ہی کے تتبع کا نتیجہ ہے۔ بقول جناب عابد علی عابد غالب کے دل میں جو حد درجہ خودداری کا جذبہ ہے وہ بیدل کی شخصیت ہی کا اثر ہے۔ غالب کو بیدل میں وہ معیاری فنکار، شاعر اور مفکر نظر آیا جسے غالب نے اپنے دل میں مثالی تصور کی طرح بسالیا۔

بیدل نے کہا تھا:

بلبل بہ نالہ حرفِ چمن را مفسّر است
یارب زبانِ نکہتِ گل ترجمانِ کیست؟

(بلبل اپنے نالوں سے چمن کی باتوں کی تفسیر بیان کرتی ہے اے اللہ پھول کی خوشبو کی زبان کس کی ترجمانی کر رہی ہے)

اسی مضمون کو ایک اور شعر میں بیدل نے یوں خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

هر سو نظر کنی گلِ رنگین شکسته است
آفاق سایه پرورِ طرفِ کلاهِ کیست؟

(جس طرف بھی نظر ڈالئے رنگین پھول بکھرے ہوئے ہیں، یہ کائنات کس کی ٹوپی کے بانکپن کی سایہ پروری کر رہی ہے)

غالب کہتے ہیں:

زین سان که سر بسر گل و ریحان و سنبل است
طرف چمن نمونۂ طرفِ کلاهِ کیست؟

(یہ جو اس طور چمن میں ہر طرف گل و ریحان و سنبل بکھرے ہوئے ہیں یہ کسی کی ٹوپی کے بانکپن کا نمونہ پیش کر رہے ہیں)

بیدل نے کہا تھا:

ز اوج افلاک اگر نداری حضورِ اقبالِ بی نیازی
نفس به جیبت غبار دارد به بین سپاهی که می خرامد؟

(یعنی اگر تم آسمان کی بلندیوں سے خدا کی بے نیاز ذات کی موجودگی کا شعور نہیں رکھتے تو تمہارا سانس تمہارے گریبان میں اپنی رفتار کا غبار رکھتا ہے تو یہ کس کی فوج ہے جو ہر دم رواں دواں ہے)

غالب کہتے ہیں:

در گردِ ناله وادیِ دل رزمگاهِ کیست؟
خونی که می دود به شرائین سپاهِ کیست؟

(یعنی میرے نالوں کی گرد میں دل کی وادی کس کی جنگ کا میدان بنی ہوئی ہے،

وہ خون جو رگوں میں دوڑ رہا ہے وہ کس کی فوج ہے؟)

غالب تماشائے عالم ایک اہل دانش کی حیثیت سے کرتے ہیں لیکن بیدل ایک اہل دل اور ایک عارف کی حیثیت سے اس تماشا گاہ عالم پر نظر ڈالتے ہیں، غالب کی نظر میں "عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"__ جبکہ بیدل کی نظر میں:

عالم تمام معبدِ تسلیمِ بیخودی است

هر سو روی به سجدهٔ اشک چکیده رو

(یعنی ساری دنیا بیخودی کو تسلیم کرنے (ماننے) کی عبادت گاہ ہے۔ جس طرف بھی جاؤ اشک چکیدہ (گرے ہوئے آنسو) کے سجدہ کے طور پر جاؤ)

غالب کی نظر میں یہ دنیا بازیچۂ اطفال ہے انہوں نے عالم مادی کے بارے میں اپنا فلسفیانہ اور کچھ صوفیانہ رنگ اس غزل میں پیش کیا ہے:

دیده در آنکه تا نهد دل بشمارِ دلبری

در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتان آزری

(یعنی دیدہ ور وہ ہے جو اپنے دل کو دل بری کے (انداز) شمار کرنے میں لگا دے اور پتھر کے دل میں بتانِ آزری کا رقص دیکھ سکے)

بیدل ایک دردمند دل کے ساتھ اس تماشا گاہِ عالم کی سیر کرتے ہیں، ان کی نظر میں تماشا گاہِ عالم آنکھ کی طرح نازک ہے:

تمام خانهٔ چشمی است این تماشا گاه

به هر کجا که نشینی نگاه وار نشین

بیدل کہتے ہیں کہ جو پھول بھی دیکھا مجھے آئینۂ خون چکیدہ نظر آیا، نجانے گلشن

کے دل میں کیسا خون چکاں کانٹا چبھا ہوا ہے:

ہر گل کہ دیدم آئینۂ خون چکیدہ بود
یا رب چہ خار در دلِ گلشن خلیدہ اند

بیدل مندرجہ ذیل شعر میں کہتے ہیں کہ دوست تو اس باغ کی سیر کر کے تغافل کے ساتھ (بغیر غور و فکر کیے) چلے گئے اور میں ہوں کہ تماشائے گل و خار پر آنسو بہا رہا ہوں:

زین باغ گذشتند حریفان بہ تغافل
تا من بہ تماشای گل و خار بگریم

طلسم ہستی کی سیر گداز کرنے کا فن بیدل کو ایک دن میں حاصل نہیں ہوا تھا اس کے لیے بقول ان کے انہوں نے ایک مدت دراز تک شمع کی طرح شعلوں سے نباہ کیا تھا:

چون شمع روزگاری با شعلہ ساز کردم
تا در طلسمِ ھستی سیرِ گداز کردم

غالب اور بیدل میں فکر و نظر اور شخصیت کا فرق ہے جو ان دونوں عظیم شاعروں کے کلام میں نمایاں ہے، غالب کہتے ہیں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بیدل نے کہا تھا کہ سب اپنی خوشیوں بھری زندگی کی آرزو کرتے ہیں میری یہ تمنا ہے کہ سارا زمانہ خوش اور خوشحال ہو جائے:

ھمہ راست زین چمن آرزو کہ بکامِ دل ثمری رسد
من و پر فشانیِ حسرتی کہ زمانہ گل بسری رسد

غالب کہتے ہیں:

بُرد گوئی خرمی از ھر دو عالم ھر کہ یافت
در بیابان مردن و در قصر و ایوان زیستن

(دونوں جہان میں اس نے شادمانی کی بازی جیت لی جس نے شاہی محل میں جینا اور بیابان میں مرنا پالیا)

بیدل نے کہا تھا:

بیدل من از وجود و عدم کردم اختیار
بی اختیار مردن و ناچار زیستن

(اے بیدل میں نے زندگی اور موت سے بے اختیار مرنا اور ناچار جینا منتخب کیا ہے)

غالب مے نوشی اور وصل و عشق کے مضامین شوخی اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں جبکہ بیدل کے ہاں ان مضامین کے بیان میں ایک خاص رکھ رکھاؤ' پروقار اور معتبر انداز ہے۔ ان کی نظر میں حسن و عشق ہی سے زندگی زیب و زینت حاصل کرتی ہے کہ انہی سے انسانیت یا انسان دوستی کے جذبے جلا پاتے ہیں:

زیب ھستی چیست؟ غیر از شورِ عشق و سازِ حسن
نکھتِ گل گر نہ ای دودِ دماغ عود باش

(زندگی شور عشق و ساز حسن کے سوا کچھ نہیں اگر تم پھول کی خوشبو نہیں بن سکتے تو عود کے دماغ کا دھواں بن جاؤ (عود جلا کر بھی خوشبو پیدا کی جاتی ہے۔ عود کی لکڑی جل کر خوشبو دیتی ہے جبکہ گلاب کے پھول کی خوشبو خود بخود پھیلتی رہتی ہے یعنی اگر زمانہ سازگار نہیں ہے تو اسے سازگار بنانے کے لیے محنت و کوشش کرو))

مضامین عشق و وصل کے بارے میں غالب کہتے ہیں:

دانش بمی در باختہ خود را زمن نشناختہ

رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل

(وہ شراب پی کر بے خودی کے عالم میں میری آغوش میں آ کر میری بغل میں چھپ گیا)

با غالبِ خلوت نشین بیمی چنان عیشی چنین

جاسوس سلطان در کمین مطلوب سلطان در بغل

(خلوت نشین غالب کے ساتھ خوف بھی ہے اور عیش بھی کہ بادشاہ کے جاسوس تاک میں بیٹھے ہیں اور بادشاہ کا مطلوب ومحبوب میری آغوش میں ہے)

وصل وعشق کے سلسلے میں بیدل نے کہا تھا:

ای از خرامت نقش پا خورشید تابان در بغل

از شوخیِ گردِ رهت عالم گلستان در بغل

(اے محبوب تیری رفتار سے تیرا نقشِ پا چمکتے سورج کو بغل میں لئے ہوئے ہے یعنی تیرا نقشِ پا سورج کی طرح منور ہے اور تیرے راستے کی گرد کی شوخی سے ساری دنیا اپنی آغوش میں چمن لئے ہوئے ہے یعنی تیری گرد راہ سے سارا عالم چمن بنا ہوا ہے)

آنچہ نتوان داد جز در دستِ محبوبان دل است

و آنچہ نتوان ریخت جز در پای محبوبان آبرو است

(محبوبوں کو صرف دل ہی پیش کیا جاسکتا ہے اور ان کے پاؤں میں صرف آبرو ہی ڈالی جاسکتی ہے)

نتوان کشید دامن ز غبار مستمندان

بخرام و ناز ها کن بسر ما و خاکِ پایت

(ہم خاکساروں کے غبار خاک سے دامن نہیں بچایا جا سکتا' تشریف لائیے' نازو ادا دکھایئے ہمارا سر ہے اور آپ کے پاؤں کی خاک ہے)

غالب کہتے ہیں:

تو طفلِ سادہ دل وھم نشین بد آموز است
جنازہ گر نتوان دید بر مزارِ ما بیا!

(تم سادہ دل ہو تمہارا ہم نشین تمہیں ہمارے خلاف بھڑکاتا ہے' جنازہ میں شریک نہیں ہو سکے تو ہمارے مزار پر ہی آجاؤ)

بیدل نے کہا تھا:

رمیدی از دیدہ بی تامل گذشتی آخر بصد تغافل
اگر ندیدی تپیدن دل شنیدنی داشت نالہ ٔ ما

(تم آنکھوں سے دور چلے گئے اور ہمارے پاس سے نہایت تغافل سے گذر گئے' اگر ہمارے دل کی دھڑکن تم نے نہیں سنی، ہمارے نالے تو سنے جا سکتے تھے)

غالب کہتے ہیں:

چہ عیش از وعدہ چون باور زعنوانم نمی آید
بنوعی گفت می آیم کہ میدانم نمی آید

(یعنی اس وعدہ پر کیا خوش ہونا جو اس عنوان سے کیا گیا کہ اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا' اس نے ''میں آؤں گا'' اس طور سے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں آئے گا)

بیدل نے کہا تھا:

این حریفان وصل می خواہند و بیدل انتظار
در محبت آرزو را اعتبار دیگر است

(یہ حریف وصل کے خواہاں ہیں اور میں بیدل انتظار چاہتا ہوں' محبت میں آرزو کا اعتبار ہی اور ہے (آرزو کا انداز یا رنگ ہی اور ہے))

غالب نے اپنی اس اردو غزل:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ھنگامہ، اے خدا، کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

میں سوالیہ انداز کے ساتھ حقائق کے اظہار کا طریقہ اپنایا تھا، بیدل کے ہاں یہ انداز موجود ہے لیکن بیدل کا انداز گہری معنویت کا حامل ہے:

بیدل:

بحر بیتاب کہ آن گوھرِ نایاب کجاست
چرخ سرگشتہ کہ خورشیدِ جھان تاب کجاست؟

(بحر بے چین ہے کہ وہ گوھرِ نایاب (یعنی ذاتِ حق) کہاں ہے؟ آسمان پریشان ہے کہ خورشید جہاں تاب (یعنی ذاتِ حق) کہاں ہے؟)

دیر ازین غصہ در آتش کہ چہ رنگ است صنم
کعبہ ازین درد سیہ پوش کہ محراب کجاست؟

(دیر اس غم سے جل رہا ہے، کہ صنم کس رنگ کا ہے کعبہ اس درد سے سیاہ پوش ہے کہ محراب کہاں ہے؟)

صبح از چہ خرابات جنون کرد بہارش؟
آفاق گرفتہ است بہ خمیازہ خمارش

(صبح کس خراباتِ جنوں سے بہار بن کر نکلی ہے کہ ساری کائنات اس خمار کے خمیازے میں مبتلا ہے)

چنین کشتۂ حیرتِ کیستم من؟
کہ چون آتش از سوختن زیستم من

(میں کس کی حیرت کا ایسا مارا ہوا ہوں کہ آگ کی طرح جلنے ہی میں میری زندگی ہے کہ سانس کی گرمی سے انسان زندہ ہے)

اگر فانیم چیست این شور ھستی؟
وگر باقیم از چہ فانیستم من؟

(اگر میں فانی ہوں تو یہ زندگی کا شور کیا ہے؟ اور اگر میں باقی ہوں تو کس لئے میں فانی ہوں، مجھے موت کیوں آتی ہے؟)___ پھر خود ہی فرماتے ہیں:

اے کہ از فہم حقایق دم زنی خاموش باش
عمر ہا باید کہ دریابی زبان خویش را

(یعنی تم جو حقایق کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہو چپ رہو ایک عمر چاہیے تا کہ تم اپنی زبان کو پاسکو یعنی کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے صحیح اندازِ بیان مدت کے بعد حاصل ہوتا ہے)۔

غالب اردو میں کہتے ہیں:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے

بیدل نے کہا تھا:

مباش ھمچو گھر مردہ ریگِ این دریا
نظر بلند کن و ھمتِ حباب طلب

(موتی کی طرح اس سمندر (دنیا) کی میراث مت بنو' بلند نظر بن کر حباب کی سی ہمت پیدا کرو)

غالب نے تخیل کے بل بوتے پر جامِ سفال یعنی مٹی کے پیالے کو جام جم سے بہتر ثابت کر دیا' جبکہ بیدل نے تخیل کے زور پر گوھر کی مٹی پلید کر دی اور حباب کی قدر گوھر سے بڑھا دی۔ ویسے بھی گوھر پانی میں چھپا رہتا ہے جبکہ حباب (بلبلہ) اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے سطح آب پر سر بلند کرتا ہے، اس طور بلبلہ گوہر سے برتر ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے گوہر کی طرح سیپی میں چھپ کر نہیں بیٹھا:۔۔۔۔غالب کے شعر میں رندانہ پن ہے اور بیدل کے شعر میں ایک حقیقت کا نیا رخ ہے جو خودی اور خودداری کے شعور کو لیے ہوئے ہے۔

بیدل نے کہا تھا:

طالبِ صحبت معنی نظران باید بود
خاک در صحنِ بھشتی کہ ندارد آدم

(اہل معنی کی صحبت کے طالب بنو' اُس جنت پر مٹی ڈالو جس میں انسان نہ ہو)

غالب کہتے ہیں:

بہ خلد از سردیِ ہنگامہ خواہم
بر افروزم بگردِ کوثر آتش

(جنت میں گرمی ہنگامہ نہ ہونے کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ کوثر یعنی حوض کوثر کے گرد آگ جلادوں)

بیدل نے کہا تھا:

در فکر خودم معنی او چھرہ کشاشد
خورشید برون ریختم از ذرہ شگافی

(میں اپنی ذات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس (ذاتِ برحق) کا جلوہ نظر آ گیا' یوں ذرہ شگافی کے عمل سے خورشید کو پالیا یعنی ذرے (اپنی ذات) کا دل چیرا تو وہاں سورج یعنی خدا مل گیا)

غالب کہتے ہیں:

آفتابِ عالمِ سر گشتگی ہای خودیم
می رسد بوی تو از ھر گل کہ می بوئیم ما

(یعنی ہم اپنی سرگشتگی کی دنیا کے سورج ہیں' جس پھول کو بھی سونگھتے ہیں اس سے تیری ہی خوشبو آتی ہے)

دونوں نے تصوف کے حوالے سے ذات حق کے بارے میں بات کی ہے' غالب کہتے ہیں کہ ہم اپنی سرگشتی کی دنیا کے سورج ہیں' جس پھول کو بھی سونگھتے ہیں اس میں تیری ہی خوشبو پاتے ہیں' بیدل کہتے ہیں کہ اپنی ذات پر غور وفکر کے دوران مجھے ذات حق کا پتا مل گیا' یوں میں نے ذرے کا دل چیرا تو خورشید کو پالیا ــــ غالب نے جس پھول کو بھی سونگھا اُس میں اُس نے ذاتِ حق کی خوشبو پائی اور بیدل نے اپنی ذات کے بارے میں جو ذرے

سے بھی کمتر ہے جب غور وفکر کیا تو اُس نے سورج (ذاتِ حق) کو پالیا___ ذات حق کی خوشبو پانا اور خود ذات حق کو پانے میں جو فرق ہے وہ صاف ظاہر___ بیدل اور غالب کے فکروفن میں جو فرق ہے وہ بھی صاف ظاہر ہے۔

انسان، زندگی، ذات حق، کفر و دین، عشق و محبت اور حق و حقیقت کی جستجو کے بارے میں غالب اور بیدل نے جو کچھ کہا وہ ان کی شخصیت اور فکروفن کی عکاسی کرتا ہے۔ دانشورِ دنیا دوست اور دانشورِ خدادوست، زندہ دل اور اہل دل، بادہ پرست اور خدامست میں جو فرق ہے وہ غالب اور بیدل میں ہے۔ غالب کا کلام ایک رندِ بادہ پرست کی دانشورانہ شوخی کا مظہر ہے جس نے ان کے کلام کو دلکش اور مقبول بنا دیا ہے، جبکہ بیدل کا کلام ایک خدامست اہل نظر اور اہل دل کی گہری اور وسیع سوچ لئے ہوئے ہے جس کے معانی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی گہرائی تک رسائی پاکیزگی ذوق اور دقیق کاوشِ ذہن کی طالب ہے۔

مآخذ

۱۔ آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور ۱۸۷۱عیسوی۔

۲۔ اقبال، کلیات فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۰ء۔

۳۔ برہم ناتھ دت، غالب کی فارسی شاعری (مقالہ) نگار پاکستان جنوری ۱۹۶۹ء۔

۴۔ بیدل، کلیات، طبع افغانستان۔

۵۔ ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، تہران ۱۳۷۱۔

۶۔ سید اطہر شیر، میرزا عبدالقادر، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ بہار، بھارت۔

۷۔ سید مہدی مجروح 'فخر عرفی ورشک طالب مرز' (مقالہ) اکمل الاخبار، دہلی، بھارت۔

۸۔ عابد علی عابد، اسلوب، طبع لاہور۔

۹۔ عباد اللہ اختر، بیدل، طبع لاہور۔

۱۰۔ عبدالغنی (ڈاکٹر)، روح بیدل، طبع لاہور۔

۱۱۔ مجنون گورکھ پوری، نکات مجنون، طبع لاہور۔

۱۲۔ محمد افضل سرخوش، کلمات الشعرا، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۴۲ء۔

۱۳۔ مرزا اسداللہ خان غالب، دیوان فارسی مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۹عیسوی۔

۱۴۔ مرزا اسداللہ خان غالب، کلیاتِ غالب (فارسی) جلد سوم، مرتبہ سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور۔

بیدل اور اقبال

میں

فکری وفنی مشارکتیں اور مغائرتیں

بیدل اور علامہ اقبال کے کلام میں اجتماعی شعور، ملت اسلامیہ کا درد، احترام و عظمت انسانی کے افکار اور خودشناسی کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرزا بیدل بھی علامہ اقبال کی طرح ملوکیت کے خلاف تھے ____ علامہ اقبال بیدل کے مداح بھی تھے اور ان کے فکروفن سے متاثر بھی، بیدل اور اقبال دونوں ہی اعلیٰ کردار کے مالک تھے، دونوں ہی ایک گونہ قلندرانہ رویہ حیات رکھتے تھے، بیدل کہتے ہیں:

در ملک قناعت بہ مہ و مہر مپرداز   گر نان شبی ہست و چراغ سر شامی

یعنی ملک قناعت میں چاند اور سورج کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو اگر تم رات کو کھانے کے لیے روٹی اور جلانے کے لیے چراغ رکھتے ہو۔

عنقا سر بر گیم مپرس از فقرا ہیچ   عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

یعنی ہم فقرا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ہمارا سرمایہ تو عنقا ہے، دنیا ہمارے افسانے رکھتی ہے اور ہم کچھ نہیں رکھتے۔

اور دونوں کا ادب کے بارے میں تقریباً ایک جیسا نظریہ تھا کہ ادب زندگی کا ترجمان ہو، زندگی آمیز بلکہ زندگی آفرین ہو، مردہ روحوں میں حیات نو کا سبب بنے۔ بیدل کہتے ہیں:

سخن سنجی کہ مدح خلق نفرید بو سواسش   مسیحای جہان مردہ گردد صبح انفاسش

یعنی وہ شاعر جو مخلوق کی مدح کا وسوسہ نہیں رکھتا اس کا سانس مردہ جہان کے لیے مسیحا ہوتا ہے۔

جاوید نامہ کی مشہور نظم ''زمزمہ انجم'' کے اس شعر میں

صدق و صفا است زندگی' نشو و نما است زندگی   تا ابد از ازل بتاز' ملک خدا ست زندگی

اس کا دوسرا مصرعہ بیدل کا ہے اس کے علاوہ جاوید نامہ ہی میں ایک غزل جو غزل زندہ رود کے عنوان سے ہے اور جس کا مطلع ہے:

بہ آدمی نرسیدی خدا چہ می جویی   زخود گریختہ ای آشنا چہ می جویی

علامہ اقبال نے میرزا بیدل کی اس غزل کی زمین میں کہی ہے:

بہ عجز کوش زنشو و نما چہ می جویی   بہ خاک ریشہ تست از ہوا چہ می جویی

یہ حقایق اس بات کا ثبوت ہیں کہ علامہ اقبال اور بیدل میں کس قدر فکری اور فنی یگانگت موجود ہے۔

فارسی غزل میں ذکر عشق و مدح محبوب تو بنیادی مضامین ہیں' شہید بلخی اور رودکی سے لے کر سنائی تک یہی انداز رہا۔ سنائی نے تصوف کے مطالب پیش کیے یہ روایت عطار' رومی اور دوسرے شعرا نے اپنائی۔ تصوف کے تحت جہاں دوسرے بہت سے مطالب آئے ساتھ ہی عظمت انسانی اور خود شناسی کے مضامین بھی غزل کا حصہ بن گئے' انسان دوستی یا عالمگیر جذبہ محبت بھی تصوف ہی کی عطا ہے ___ لیکن اجتماعی اور ملی مسائل کا شعور جس کے سب سے بڑے علمبردار علامہ اقبال ہیں' فارسی غزل میں مدھم رہا' صرف چند شعرا نے لطیف اشاروں اور کنایوں میں اپنے عہد پر تنقید کی ہے' حافظ کی غزلوں میں ایسے اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً

رسم بد عہدی ایام چو دید ابر بہار گریہ اش بر سمن و سنبل و نسرین آمد

☆☆ ☆☆

آب و ہوای پارس عجب سفلہ پرور است کو ہمرہی کہ خیمہ ازین خاک بر کنم

☆☆ ☆☆

اینچہ شوری است کہ در دور قمر می بینم ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

☆☆ ☆☆

خواہم شدن بکوی مغان آستین فشان زین فتنہ ھا کہ دامن آخر زمان گرفت

بیدل نے اس رنگ کو غزل میں زیادہ گہرا کیا' اس کی غزلوں میں عوامی مسائل کا شعور بہت زیادہ ملتا ہے ___ بیدل نے مثنویوں میں خاص طور پر اجتماعی اور معاشرتی مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' غزلوں میں بھی اجتماعی شعور کا رنگ جھلکتا ہے:

الحذر آن تندی کز طبع مردم گل کند اتفاق این غبار از برق ہم سوزان تر است

از ہجوم عاجزان غافل نباید زیستن مور مسکین ہر کجا جوشید با ہم اژدر است

امتیاز نیک و بد محو است در جوش عوام چون بلند افتاد آتش خشک و تر خاکستر است

☆☆ ☆☆

گر سلامت خواہی از ساز تظلم دم مزن دادرس در عہد ما سنگ است و مینا داد خواہ

☆☆ ☆☆

امروز اگر انصاف دھد داد طبایع کس منتظر مہدی و دجال نباشد

☆☆ ☆☆

در خرابات عالمِ دوار نشہ آزادی ست جملہ خمار

بیدل کا زمانہ کوئی بہت ابتلا کا زمانہ نہیں تھا۔ بیدل نے شاہجہان کا سنہری دور

دیکھا تھا' شہنشاہ عالمگیر کا عہد بھی خوب تھا البتہ شہنشاہ عالمگیر کے جانشینوں کا دور اچھا نہیں تھا مجموعی طور پر دنیا میں مسلمانوں کا حال برا نہیں تھا' ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی' دنیائے اسلام میں خلافت عثمانیہ بھی قائم تھی ___ اس لئے بیدل کے ہاں ملت کے درد کا وہ شدید احساس نہیں ہے جو علامہ اقبال کے کلام میں موجود ہے۔ علامہ اقبال سے پہلے ۱۸۵۷ء کا سانحہ گذر چکا تھا اور خلافت عثمانیہ کا زوال خود ان کی نظروں کے سامنے ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بیدل کے کلام کے مقابلہ میں علامہ کے کلام میں ملی جذبہ زیادہ گہرا اور ہمہ گیر ہے' پھر بھی چونکہ بیدل ایک سچّے مسلمان' صوفی صاف دل تھے' اس لئے مسلمانوں کی عام اخلاقی بدحالی اور فرقہ پرستی نے انہیں متاثر کیا تھا اور حضرت عالمگیر کے بعد ہندوستان کے حالات سے بھی وہ دل گرفتہ ہوئے تھے۔ ان باتوں کا اثر ان کی غزلوں میں موجود ہے:

بیدل آن قرآن کہ مادرس حضورش خواندہ ایم   متن آیاتش تحیر دارد و تفسیر شرم

☆☆ ☆☆

بیدل امروز در مسلمانان   ہمہ چیز است لیکن ایمان نیست

☆☆ ☆☆

ای بوہم حب' گرفتار حسد هشیار باش   کاین چنین آگہیت ننگ دوعالم غفلت است

بیدل دور شاہ جہانی کو یوں یاد کرتے ہیں:

یادِ آن موسم کہ بی وہمِ بہار و فصلِ دی   داشت مینای فلک جامِ طرب لبریز ِی
انجمن نازان' چمن خندان' طراوت گلفشان   شاخِ گل رقاص' بلبل بستہ در منقارنی
دورِ سعدی بود و عہدِ امن و ایامِ شریف   خلق در حمدِ خدا از عدلِ شاہ نیک پی

اور یہ غزل یوں لگتا ہے کہ معاشرہ اور ماحول کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر لکھی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے شہنشاہ عالمگیر کے جانشینوں کے دور میں ہندوستان میں جو ملوک

الطوائفی اور بدنظمی موجود تھی یہ غزل اس کے پس منظر میں وجود میں آئی ہو:

تاچند بھرمردہ و بیمار بگریم　　وقت است بخود گریم و بسیار بگریم
زین باغ گذشتند حریفان بہ تغافل　　تامن بہ تماشای گل و خار بگریم
بربیکسیم رحم نکردند رفیقان　　فریاد بہ پیش کہ من زار بگریم
ای غفلت بیدردچہ ہنگامہ کوری است　　او در بر و من در غم دیدار بگریم
تدبیر گداز دل سنگین نتوان کرد　　چون ابر چہ مقدار بہ کہسار بگریم
تاکی چو شرر سر بہ ہوا اشک فشاندن　　چون شیشہ دمی چند نگونسار بگریم
شاید قدحی پُرکنم از اشک ندامت　　می نیست درین میکدہ بگذار بگریم
ناسور جگر چند کشد رنج چکیدن　　برسنگ زنم شیشہ و یکبار بگریم

ھر چند زغم چارہ ندارم من بیدلؔ
این چارہ کہ فرمود کہ ناچار بگریم

یہ غزل ایک حد تک علامہ اقبال کی بانگ دراوالی نظم ''تصویر درد'' کے کچھ اشعار کا گویا نقش اول ہے۔ ''تصویر درد'' کے خاص طور پر یہ اشعار پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ دونوں منظومات میں غزل اور نظم کے فرق کے ساتھ کم از کم درد کے اظہار کی نوعیت ایک ہی ہے:

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

تھمے کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

نیز ''تصویر درد'' کے پہلے بند کو علامہ اقبال نے بیدل کے اس شعر پر ختم کیا ہے:

''درین حسرت سرا عمری است افسون جرس دارم
زفیض دل تپید نہا خروش بے نفس دارم''

عظمت انسانی کے مطالب بیدل کے کلام میں بہت زیادہ ہیں۔ مثنوی عرفان میں خاص طور پر اس عنوان سے انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ بہت ہی فکر انگیز ہے مثلاً انسان تجلی ادراک بھی ہے اور لولاک کی حقیقت بھی۔ اس کا حسب ''قاب قوسین'' ہے اور اس کا نسب ''اوادنی'' ہے ''اقترب'' وصال اور ''لی مع اللہ'' حضوری ہے، عشق اس کی ذات کا جوہر اور جلوہ اس کی آیات کا فروغ ہے۔ انسان کی گفتگو کے علاوہ جو کچھ ہے وہ خاموشی ہے اور جو کچھ اس کی یاد کے علاوہ ہے فراموشی ہے، جو کچھ تم جانتے ہو وہ انسان ہی کی دانش ہے جو کچھ تم پڑھتے ہو وہ انسان ہی کی گفتگو ہے۔ کن فکان اس کی قدرت سخن کی بنیاد ہے اور لفظ ''یارب'' اس کے عجز کا اظہار ہے۔ حق اس سے آشکارہ وہ حق سے آشکار ہے۔ سورج ہے اور خاک نشین ہے، افلاک کا مالک ہے لیکن خاکسار ہے:

چیست آدم تجلی ادراک ۔۔۔ یعنی آن فھم معنی لولاک
قاب قوسین قربت حسبش ۔۔۔ لیک نزدیک تر ازان نسبش
''اقترب'' ھم کنار طاعت او ۔۔۔ ''لی مع اللہ'' حضور غیبت او
چیست۔ عشق؟ اصل جوھر ذاتش ۔۔۔ جلوہ یعنی فروغ آیاتش
ھر چہ جز حرف اوست خاموشی ۔۔۔ آنچہ جز یادِ او فراموشی
دانش اوست آنچہ می دانند ۔۔۔ سخن اوست آنچہ می خوانند
کن فکان اصل قدرت سخنش ۔۔۔ یارب اظہار عجز ماؤ منش
حق از و آشکار و او از حق ۔۔۔ مطلق از قید و قید از مطلق
آفتاب است و خاک می مالد ۔۔۔ آسمان دارد و نمی بالد

(مثنوی عرفان از بیدل، ص ص ۱۴تا۱)

غزلوں میں بھی یہ مضامین بڑی فراوانی سے بیان ہوئے ہیں:

بہ بیان کمال شریعتی، بہ عمل شکوہ طریقتی بخیال خیر حقیقتی، تو قیامتی تو قیامتی
بفلک فروغ تو در نظر، بہ زمین بہار تو جلوہ گر بہ چمن سحاب و بگل سحر، ھمہ جا ظہور کرامتی

☆☆ ☆☆

بجہان جلوہ رسیدہ ام، زھزار پردہ دمیدہ ام ثمر نہال حقیقتم، چمن بہار خدائیم
سر کعبہ گرم فسون من، دل دیر و جوشش خون من بگذر ز سیر جنون من، کہ قیامت ھمہ جائیم

☆☆ ☆☆

زساز محفل تحقیق این آوازمی آید کہ ای آھنگ یکتائی ازین نہ پردہ عریان شو

ھر چند ہستی من بی مغزی حباب است دریا سری ندارد جز در تہ حبابم

خودشناسی کے تصورات بیدل کے کلام میں عام ہیں، مثنویوں میں بھی اور غزلوں میں بھی، مندرجہ ذیل میں سے کچھ اشعار تو علامہ اقبال کے اشعار معلوم ہوتے ہیں:

بہر جا تجلی پیامِ خودی ھمان در خفای دوام خودی

☆☆ ☆☆

یکتای حقیقتی شمارت این است حیرانِ خودی، آئینہ دارت این است

☆☆ ☆☆

ہم تو تعبیر و ہم تو خوابِ خودی موج لب تشنۂ سراب خودی

☆☆ ☆☆

بیدل نکشیدیم زکس جامِ مدارات مردیم بہ مخموری صہبای تغافل

☆☆ ☆☆

اے کہ تو غافل از کمال خودی از تمیز جنون، خیال خودی

☆☆ ☆☆

بیدل از خویشان نمی باید اعانت خواستن مومیای چارہ فرمای شکست شیشہ نیست

☆☆ ☆☆

عجز رنگم بفلک ناز ھمائی دارد کہکشان سایہ اقبال پر کاہ من است

☆☆ ☆☆

عنان گیر غبار کس مبادا افسون خودداری وگرنہ ساحل ما نیز دارد جوش دریایی

☆☆ ☆☆

فارسی شاعری میں سب سے پہلے بیدل نے ملوکیت کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی نظر میں بادشاہ اور ڈاکو میں کوئی فرق نہیں، بادشاہت ایک قسم کی منظم رہزنی ہے۔ مثنویوں میں اس پر تمثیل کے رنگ میں بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔ بیدل نے کسی بادشاہ وقت کی تعریف نہیں کی، بلکہ مدح بادشاہ کی یوں مذمت کرتے ہیں:

ای کہ تعریف سلاطین کردہ ای مشق تعلیم شیاطین کردہ ای

☆☆ ☆☆

فی الحقیقت آتش است این شاہ نیست لیک ہر آتش پرست آگاہ نیست

☆☆ ☆☆

قرب این آتش بلای جان تست برق دین و خرمن ایمان تست

ایک جگہ فرماتے ہیں:

ای بسا معنی روشن کہ ز حرصِ شعرا خاکِ جولانگہ اسپ و خرِ اھلِ جاہ است

مادحِ اھل صفا باش کہ در علمِ یقین وصف این طایفہ تفسیرِ کلام اللہ است

علامہ اقبال کی طرح بیدل بھی زندگی کے بارے میں حرکی (Dynamic) نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی علامہ اقبال کی طرح زندگی کی اعلیٰ اقدار کا شعور ملتا ہے، وہ

علامہ اقبال کی طرح آرزو، بلند ہمتی اور سعی و کوشش کو اعلیٰ زندگی کی اساس سمجھتے ہیں۔ ایک صوفی صاف دل ہونے کے باوجود بیکاری کی، خواہ وہ تصوف کے نام پر ہو، یوں مذمت کرتے ہیں:

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد
غافلان نام فضولی را تصوف کردہ اند

یہ دونوں عظیم شاعر زندگی کے بارے میں مفکرانہ نظریہ رکھتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ بیدل کے نظریہ زندگی میں متصوفانہ افکار کی بھی آمیزش ہے جب کہ علامہ اقبال کے نظریۂ حیات پر مصلحانہ افکار غالب ہیں۔

علامہ اقبال:

زندگی انجمن آرای و نگہدار خوداست　　ای کہ در قافلہ ای بی ہمہ شو با ہمہ رو

☆☆ ☆☆

ای لالہ ای چراغ کہستان و باغ و راغ　　در من نگر کہ مید ہم از زندگی سراغ

☆☆ ☆☆

بہ کیش زندہ دلان زندگی جفا طلبی است　　سفر بکعبہ نکر دم کہ راہ بی خطر است

☆☆ ☆☆

زمرگ و زیست چہ پرسی درین رباط کہن　　کہ زیست کاھش جان، مرگ جانکنی دارد

☆☆ ☆☆

بشاخِ زندگی ما نمی زتشنہ لبی است　　تلاشِ چشمہ حیوان دلیلِ کم طلبی است

☆☆ ☆☆

رمزِ حیات جویی جز در تپش نیابی　　در قلزم آرمیدن ننگ است آبجورا

بیدل:

عمر گذشت و همچنان داغ وفاست زندگی	زحمت دل کجا بریم آبلہ پاست زندگی
دل بزبان نمی رسد لب بہ فغان نمی رسد	کس بہ نشان نمی رسد تیر خطاست زندگی
تا نفس آیت بقااست نالہ کمین مدعاست	دود دلی بلند کن دست دعاست زندگی
از همہ شغل خوشتر است صنعت عیب پوشیت	پنبہ بروی هم بدوز دلق گداست زندگی
یکدو نفس خیال باز رشتہ شوق کن دراز	تا ابد از ازل بتاز ملک خداست زندگی
شورِ جنونِ ما و من جوش و فسونِ وهم و ظن	وقف بهار زندگیست لیک کجاست زندگی

☆☆ ☆☆

غافل از سیر گداز دل نباید زیستن	هست در خون گشتنت رنگی کہ در گلزار نیست

☆☆ ☆☆

چون شمع روزگاری باشعلہ ساز کردم	تا در طلسم هستی سیر گداز کردم

☆☆ ☆☆

زیب هستی چیست غیر از شور عشق و ساز حسن	نگهت گل گر نہ ای دودِ دماغ عود باش

☆☆ ☆☆

تا کی زخلق پردہ برو افگنی چو خضر	مردن بہ از خجالت بسیار زیستن
غفلت زداست پرتوِ اندیشۂ کریم	حیف است یاد عهدو گنهگار زیستن
(بیدل) من از وجود و عدم کردم انتخاب	بی اختیار مردن و ناچار زیستن

☆☆ ☆☆

چون رنگ عیان نیست کہ این ھستی موھوم   آمد زکجا آمدوگر رفت کجا رفت

☆☆ ☆☆

زین بادیہ رفتم کہ بسر چشمہ خورشید   چون سایہ بشویم زجبین گرد سفر را

☆☆ ☆☆

یادٌ آن غفلت کہ ازگرد متاع زندگی   عمر دامن چیدہ بود و ما دکانی داشیم

☆☆ ☆☆

افسانہ ہای بیون و رستم بہ طاق نہ   گر مردِ قدرتی دلت از بندِ کین کشا

☆☆ ☆☆

دلی خون کردم ودر آب دیدم نقش امکان را   گدازِ قطرۂ من عالمی را کرد دریائی

☆☆ ☆☆

داغ نیرنگم مپرس از مطلبِ نایابِ من   جستجوی ھرچہ کردم محرم عنقا شدم

☆☆ ☆☆

زین عرصۂ اضداد مکش تنگِ فسردن   گیرم ھمہ تن صلح شدی جنگ برون آ

☆☆ ☆☆

درین رہ شود پائمال حوادث   چو نقش قدم ھرکہ خوابیدہ باشد

☆☆ ☆☆

بہار آرزو دردل گل امید در دامن   بہ ھر رنگی کہ می آیم چمن پرواز می آیم

☆☆ ☆☆

مباش ھمچو گہر مردہ ریگ این دریا   نظر بلند کن و ھمت حباب طلب

☆☆ ☆☆

به پرواز آنقدر مایل نشد عنقای رنگ من　　که شاهین کبوتر خانه افلاک می کردم

☆☆ ☆☆

گرمی هنگامه آفاق موقوف تب است　　روز اگر خورشید باشد شمع شب با آتش است

☆☆ ☆☆

هر چند هستی من بی مغزی حباب است　　دریا سری ندارد جز در ته کلاهم

☆☆ ☆☆

عرصه کون و مکان وسعت یک گام نداشت　　چون نگه بی هوده اندیشهٔ جولان کردم

☆☆ ☆☆

از ازل این بیش و کم دارد خروش امروز نیست　　اینکه خواندم بیش بیش است آنکه گفتم کم کم است

☆☆ ☆☆

با که باید گفت بیدل ماجرای آرزو　　مقصد غواص ازیں نه بحر یک گوهر بود

☆☆ ☆☆

درهای فردوس وا بود امروز　　از بی دماغی گفتیم فردا

☆☆ ☆☆

حاصل عمر از جهان یکدل به دست آوردن است　　آنچه دل خواه من است از عالم ادراک نیست

☆☆ ☆☆

انتظار صبح محشر عالمی را خاک کرد　　عمرها رفت و همین امروز و فردا می رود

☆☆ ☆☆

از ذره تا مه و مهر آمادهٔ رحیل است　　هرپای در رکابی هرتوسنی وزینی

☆☆ ☆☆

حیف از ان بی خبری چند کہ باقدرت جاه خاک گشتند و نکروند بیاران مددی
درقناعت همه اسباب بزیر قدم است موراین دشت نخواهد ز سلیمان مددی

علامہ اقبال اور بیدل میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ بیدل علامہ اقبال کی طرح وصل کی بجائے انتظار وفراق کے طالب ہیں۔

علامہ اقبال:

گفتی مجو وصالم بالا تر از خیالم عذر نو آفریدی اشک بهانه جورا
شادم کی عاشقان را سوز دوام دادی درمان نیافریدی آزار جستجورا

بیدل:

در محبت آرزو را اعتبار دیگراست این حریفان وصل می خواهند و بیدل انتظار
همه عمر با تو قدح زدیم نه رفت رنج خمار ما چه قیامتی که نمی رسی زکنار ما به کنار ما
پی جستجوی عنقا به کجا توان رساندن نه سراغ فهم روشن نه چراغ آشنائی

ذیل میں درج کئے گئے ان دونوں عظیم مفکر شعرا کے اشعار اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ میرزا بیدل اور علامہ اقبال کے افکار میں کسی قدر یگانگت اور ہم آہنگی ہے۔

علامہ اقبال:

ما از خدا گم شده ایم او به جستجو است چون ما نیازمند و گرفتار آرزو است

بیدل:

از ما سراغ ما کن وهم دوئی رها کن جایی که ما نباشیم آئینه هم بناشد

علامہ اقبال:

از همه کس کناره گیر محبت آشنا طلب هم ز خدا خودی طلب هم ز خودی خدا طلب

بیدل:

بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب　　تو ز اشک آن ھمہ کم نہ ای قدمی ز آبلہ پا طلب

طلب تو بس بود این قدر کہ ز معنی بہ بری اثر　　بخودت اگر نرسد نظر بہ خیال ہیچ و خدا طلب

☆☆ ☆☆

بصد انجمن من و ما سر و برگ ماست یکتا　　ھمہ موج یک محیطیم ھمہ خلق یک خدائی

☆☆ ☆☆

لب از اظہار مطلب بند و تسخیر دو عالم کن　　درین یک دانہ دارد دامہا صیاد خاموشی

علامہ اقبال:

چو بہ کمال می رسد فقر دلیل خسروی است　　مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

بیدل:

گدای کز سر کوی تو خاکی بر جبین مالد　　بتاج کیقباد و افسر قیصر کند بازی

علامہ اقبال:

ساز تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم　　ھر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تار من است

میرزا بیدل:

بی وجود ما ہمیں ہستی عدم خواھد شدن　　تا درین آئینہ پیدائیم عالم عالم است

نیستم آگہ چہ دارد خلوت یکتائیش　　اینقدر دانم کہ آنجا ھم ھمین من بودہ ام

علامہ اقبال:

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست　　نگاہ ماست کہ برلالہ رنگ و آب افزود

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم　　این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاریہا است　　مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازین کردند

میرزا بیدل:

باغ دھر از ما است بیدل روشناس رنگ درد　　لالہ سان آئینۂ داغ جگر داریم ما

آفاق ز پروازِ غبارم مژہ پوشید　　از سرمہ بھر چشم رسید است سلامی

بیش ازان است در آئینۂ من مایۂ نور　　کہ بھر ذرہ دو خورشید نمایم تقسیم

علامہ اقبال:

این ھم جہانی، آن ہم جہانی　　این بیکرانی آن بیکرانی

ھر دو خیالی ھر دو گمانی　　از شعلہ من موج دخانی

میرزا بیدل:

چہ دام است دنیاچہ نام است عقبیٰ　　تو معمار این خانہ ھای گمان را

غالب نے اس بات کو اردو میں یوں کہا تھا:

جلوہ مشتاقم بہشت و دوزخم منظور نیست　　میروم از خویشتن درھر جا کہ می خوانی مرا

طالب ویرانہا غیر جنونت کہ کرد　　آنچہ تو خواندی بہشت خانۂ بی آدمی ست

طبعیکہ امیدش اثر آمدہ بیم است　　گر خود ھمہ فردوس بود ننگ جحیم است

چہ دنیاچہ عقبیٰ خیال است بیدل　　تو باش این و آن گر نباشد نباشد

علامہ اقبال:

دل عاشقان بہ میرد بہ بہشت جاودانی　　نہ نوای درد مندی، نہ غمی، نہ غمگساری

بیدل:

گویند بہشت است ھمہ راحت جاوید　　جائیکہ بداغی نہ تپد دل چہ مقام است

نہ باغ دانم نہ خلد این قدر دانم　　کہ گرد راہ خیال تو رنگہا دارد

حرص ھر سومی برد برسیم وزر دارد نظر　　زاھد از فردوس ھم مطلوب جز دنیا نداشت

طالب صحبت معنی نظر ان باید بود خاک در صحن بهشتی که ندارد آدم

علامہ اقبال:

برتر از گرددن مقام آدم است اصل تهذیب احترام آدم است

میرزا بیدل:

آدمیت زخویش باخبری است ؎ ما بقی هرچه هست گاوٗ خری است

علامہ اقبال:

این جهان چیست صنم خانه پندار من است جلوهٔ او گرو دیده بیدار من است

همه آفاق که گیرم به نگاهی اورا حلقه ای هست که از گردش پرکار من است

میرزا بیدل:

تمام خانه چشمی است این تماشا گاه به هر کجا به نشینی نگاه دار نشین

☆☆ ☆☆

هر سو نظر کنی گل رنگین شکسته است آفاق سایه پرور طرف کلاه کیست

☆☆ ☆☆

عرصه کون و مکان وسعت یک گام نداشت چون نگه بی هوده اندیشه جولان کردم

☆☆ ☆☆

به پرواز آنقدر مایل تشد عنقای رنگ من که شاهین کبوتر خانه افلاک می کردم

☆☆ ☆☆

لب از اظهار مطلب بند و تسخیر دو عالم کن درین یک دانه دارد دامها صیاد خاموشی

علامہ اقبال:

ای من از فیض تو پایندہ، نشان تو کجا است؟ این دو گیتی اثر ما است، جہان تو کجا است؟

☆☆ ☆☆

نہ بہ بادہ میل داری، نہ بہ من نظر کشائی عجب این کہ تو ندانی، رہ و رسم آشنائی

میرزا بیدل:

بہ نموسری ندارد گل باغ کبریائی ندمیدہ ئی برنگی کہ بگویمت کجائی
چہ شگرف دلربائی چہ قیامت آشنائی نہ زماست عالم تو نہ تو از جہان مائی

علامہ اقبال:

ھستی و نیستی از دیدن و نادیدن من چہ زمان چہ مکان شوخی افکار من است

میرزا بیدل:

بیدل چہ ازل کو ابد از وھم برون آ درکشور تحقیق نہ صبح است نہ شامی

☆☆ ☆☆

ساز ھستی و عدم بست و کشاد چشم ماست خواب و بیداری ندارد بیش ازین فہمیدنی

☆☆ ☆☆

داغ نیر نگیم تابِ آتشِ دیگر کراست دوزخ امروز ما اندیشۂ فردا بس است

☆☆ ☆☆

تا درین محفل تامل بر بساطِ حال ریخت ساغر ماضی بگردش رنگ استقبال ریخت

☆☆ ☆☆

ورنہ این جا حال کو مستقبل و ماضی کدام قلقل وھمی است کز مینای قبل و قال ریخت

☆☆ ☆☆

بی وجود ماهمین هستی عدم خواهد شدن   تا درین آئینه پیدائیم عالم عالم است

میرزا بیدل اور علامہ اقبال اپنے اعلیٰ افکار کو پیش کرنے کے لئے کچھ مخصوص علامتیں اپنے کلام میں لاتے ہیں، علامہ اقبال کی علامتیں شاهین اور لالہ ہیں جب کہ بیدل کے ہاں عنقا، طاؤس اور حباب ہیں، بیدل کے ہاں عنقا ذات حق کی بھی علامت ہے۔ بیدل کہتے ہیں:

ہر چند کہ عنقا ز خیال تو بردن است   هر رنگ کہ داری بہ نظر نقش پراوست

☆☆ ☆☆

پی جستجوی عنقا بہ کجا توان رساندن   نہ سراغ فهم روشن نہ چراغ آشنایی

بیدل نے عنقا سے ذات انسانی بھی مراد لی ہے:

بہ پرواز آنقدر مائل نہ شد عنقای رنگِ من   کہ شاہینِ کبوتر خانۂ افلاک می کردم

طاؤس ایک جمالیاتی علامت بھی ہے، کائنات کا استعارہ بھی اور آئینہ ماسوائے حق کی بھی علامت ہے۔ حباب کو بھی انہوں نے اپنے تخیل کے زور پر بہت سے نئے معانی پہنائے ہیں:

نفس تا می کنم فردوس در پرواز می آید   برنگ بال طاووس آرزوها در قفس دارم

☆☆ ☆☆

ندانم گل فروش باغ نیرنگ کیم بیدل   هزار آئینہ دارد درپر طاووس تمثالم

☆☆ ☆☆

سیر گلزار کہ یارب در نظر دارد بہار   از پر طاووس دامن برکمر دارد بہار

یعنی بہار جسے اپنی حسن آفرینی پر ناز تھا وہ گلزار حسن محبوب کی سیر کے لئے اس انداز سے بن سنور کر نکلتی ہے کہ اپنے دامن کو مور کے پروں سے آراستہ کر کے کمر پر لپیٹے

ہوئے ہے:

دام جوہر نسخۂ طاووس دارد در بغل　　این قدر رنگی کہ شد یارب شکار آئینہ

محمل نازش زصحرایی کہ بال افشان گذشت　　گرد اگر برخاست طاووس چمن پیرا بود

یعنی جس صحرا سے محبوب کی محمل ناز گذری ہے وہاں اگر غبار بھی اٹھا تو وہ چمن کی آرائش کا طاووس بن گیا ہے:

طاووس مابہار چراغان حیرت است　　آئینہ خانہ ای بہ تماشا رساندہ ام

نقد گردون نیست غیر از اعتبارات جہان　　چون حباب این کاسۂ وہم از ہوا بالیدہ است

زاحتیاط ادب گاہ این محیط مپرس　　نفس گرفتہ برون آمدہ است حباب

ہر چند چون حبابم بی دستگاہ قدرت　　تسخیر عالم آب برگی است از کلاہم

کہ دارد طاقت ہم چشمی ظرف حباب من　　محیط از خود تہی گردید تا بیدل برون آمد

ہر چند ہستی من بی مغزی حبابی است　　دریا سری ندارد جز در تہ کلاہم

درکار گاہِ دل بہ ادب باش و دم مزن　　پُر نازک است صنعت میناگر حباب

زسیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب　　سراگر بہ گریبان فروبرد دریاست

ہر کہ از خود شد تہی از ہستی مطلق پر است　　از حباب من سراغ گوہر نایاب گیر

مباش ہمچو گہر مردہ ریگ این دریا　　نظر بلند کن و ہمت حباب طلب

چون حباب اینجا متاع خانہ برق خانہ است　　آہ نتوان گفت آتش درجگر داریم ما

از ما سراغ ماکن وہم دوئی رہا کن　　جائی کہ مانباشیم آئینہ ہم نباشد

زبان حیرت آئینہ این نوادارد　　کہ ای جنون زدہ خودرا زماچہ جویی

از ہزار آئینہ یک نور یقینش منعکس　　از دو عالم نسخہ اش یک نقطۂ دل منتخب

بیدل اور اقبال میں فکر وفن کے لحاظ سے فرق بھی ہے، بیدل سبک ہندی کے

نمائندہ شاعر ہیں جب کہ علامہ اقبال کے ہاں سبک ھندی کا اثر بہت کم ہے، وہ خود ایک سبک کے موجد ہیں، جسے سبک اقبال کہا جا سکتا ہے۔

بیدل اور علامہ اقبال میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ بیدل کے ہاں مفکرانہ حیرت اور علامہ اقبال کے ہاں حکیمانہ اور مصلحانہ یقین ہے۔ بیدل کے ہاں مستی اور تحیر کی سی کیفیت ہے، یہ شاعر خدامست خدا کے جلال و جمال کے مناظر جو کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں دیکھتا ہے، غور کرتا ہے اور مسرور و متحیر ہوتا ہے، یہ تحیر کا عنصر بیدل کے کلام میں ان کی جذب و مستی کی کیفیت کا بھی آئینہ دار ہے اور ان کے عارفانہ فہم کا عکاس بھی، بیدل کی نظر میں تو پتھر میں بھی دل دھڑک رہا ہے، یہ بھی ایک مینا خانہ دل ہے اسے بھی ذرا آہستہ سے ہاتھ لگایئے:

مباد اینجا زنی برسنگ دستی   کہ مینا در بغل خفت است مستی

ذرے سے آفتاب تک حق کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں لیکن لوگ اس سے غافل ہیں:

ذرہ تا خورشید عرفان جلوہ است اما چہ سود   دیدہ ھای خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است

ان کی نظر میں جو لوگ گلزار عالم کی سیر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں وہ سکون قلب سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے:

زسیر گلزار چشم بستن کسی نہ شد محرم تسلی   کجا است آئینہ تا نمایم چہ صبح دارد بہار رنگش

اگر گل چہرہ آراید و گرمی جام پیماید   نگاھی می کنم امانمی دانم چہ می بینم

گہی از شوق می بالم گہی از یاس می نالم   مپرس از حیرت حالم قیامت ساز دیرینم

جنون نذر شنیدن ھا تحیر وقف دیدنہا   کزین خرمن بجز برق نظر حاصل نمی باشد

بیدل خود کو آئینہ بردار جمال لاہوت کہتے ہیں اور ان کی حیرت بوجہ جہل نہیں بوجہ

آ گہی ہے:

اے آئینہ بردار جمال لاہوت　　از حیرت خویش اندکی آگاہ باش

مجموعی طور پر بیدل کا مقصود شعر انسانیت کی تعمیر ہے جب کہ علامہ اقبال کا مطمح نظر ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ علامہ اقبال نے اردو میں فرمایا تھا:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یا فارسی میں یوں فرماتے ہیں:

فردرا ربط جماعت رحمت است　　جوھر اورا کمال از ملت است

اور بیدل کہتے ہیں۔ اس محفل من و ما میں ہمارا سرمایہ توحید یا یکتا پرستی ہے۔ سارے انسان ایک ہیں کہ خدا کی مخلوق ہیں گویا ایک سمندر کی لہریں ہیں:

بصد انجمن من و ماسرو برگ ماست یکتا　　ھمہ موج یک محیطیم ھمہ خلق یک خدائی

بیدل خدامست تھے اس لئے ان کی غزلوں میں حمد حق کے فکر انگیز اور ایمان افروز مطالب بہت زیادہ ہیں اور اس عنوان سے بھی وہ فارسی کے بے مثال شاعر ہیں ___ اسی عشق حق کا ایک اثر انسان دوستی کا وہ شدید جذبہ ہے جو ان کے کلام میں بہت نمایاں ہے ___ جب کہ ملی جذبہ اور ملت کا درد علامہ اقبال کے کلام پر چھایا ہوا ہے ___ علامہ اقبال کے ہاں ایک مصلحانہ اضطراب، ایک حکیمانہ پیچ و تاب کی سی کیفیت ہے۔ جب کہ بیدل کے ہاں عارفانہ سکون و تمکین ہے:

بیدل منم آن گوھر دریای تحمل　　کز لنگر من شورش دریا گلہ دارد

لیکن دونوں ہی بہت بڑے شاعر اور مفکر تھے اور ان دونوں شاعروں نے غزل میں اپنے زندگی آمیز اور حیات آموز افکار عالیہ کو جس باکمال خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، فارسی غزل کی گیارہ سو سالہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

مآخذ

☆ بیدل، کلیات، طبع افغانستان۔
☆ عباداللہ اختر، بیدل، طبع لاہور۔
☆ عبدالغنی (ڈاکٹر)، روح بیدل، طبع لاہور۔
☆ علامہ اقبال، کلیات فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۰ء۔